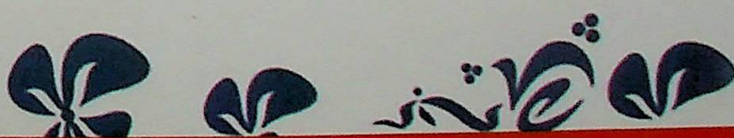
بلھا کیہ جاناں میں کون؟

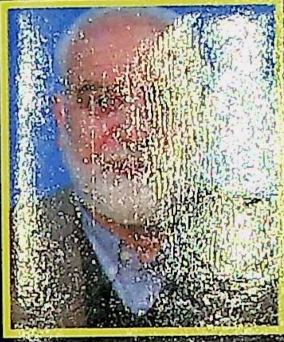
(افسانوی مجموعہ)

ڈاکٹر اشرف آثاری





زیر اہتمام: نگینہ پبلیکیشنز ہوٹل شہنشاہ پیلس بلیوارڈ ڈلگیٹ سرینگر - ۱۹۰۰۰۱ (کشمیر)



من کہ

نام:۔ محمد اشرف شاہ پارسا

والدِ محترم:۔ مرحوم پیر احسن شاہ پارسؔا

آبائی سکونت:۔ آثارِ شریف حضرت بل درگاہ متصل زیارت شریف

موجودہ سکونت:۔ صدرہ بل حضرت بل سری نگر کشمیر

تعلیم:۔ پوسٹ گریجویشن یونیورسٹی آف کشمیر

تصانیف:۔ عصری ادب کے رنگ و آہنگ (تنقیدی و تحقیقی مضامین)

علامہ اقبال اور قادیانیت (اقبالیات)

افسانہ لکھ رہا ہوں (افسانوی مجموعہ)

طبِ ہومیوپیتھی ----------------

”ہومیوپیتھی اور نوجوانوں کے جنسی مسائل

”ہومیوپیتھی اور دمہ

”ہومیوپیتھی اور برص

”ہومیوپیتھی اور پراسٹیٹ

”ہومیوپیتھی اور گردوں کی پتھریاں

چیف ایڈیٹر:۔ ہومیومیڈیکل ٹائمز

سینئر رکنِ مجلسِ مشاورت:۔ نگینہ انٹرنیشنل سری نگر

اعزازات:۔

۱۔ وفا بھدرواہی فاؤنڈیشن ایوارڈ

۲۔ سارہ محمد عبداللہ ایوارڈ ۲۰۱۴ء برائے اردو تنقید

۳۔ تحریک ادب بنارس ۲۰۱۴ء یادگار محبت ایوارڈ

۴۔ عمر مجید فاؤنڈیشن ایوارڈ ۲۰۱۵ء

۵۔ نگینہ انٹرنیشنل ایوارڈ ۲۰۱۷ء برائے معاونت تحقیق

۶۔ بخشی میموریل ایوارڈ ۲۰۱۸ء برائے اردو ادب

جناب اقبال لون صاحب کی نذر
اشرف آثاری
23-09-18

بسم اللہ الرحمان الرحیم

بلھا کیہ جاناں میں کون؟

(افسانوی مجموعہ)

افسانہ نگار:۔ ڈاکٹر اشرف آثاری

ناشر : صبا پبلی کیشنز صدرہ بل حضرت بل سری نگر کشمیر (جموں و کشمیر)

بہ اہتمام:۔
نگینہ پبلیکیشنز ہوٹل سہنشاہ پیلس بلیوارڈ ڈلگیٹ سرینگر۔ ۱۹۰۰۰۱ (کشمیر)

نام کتاب : بلھا کیہ جاناں میں کون؟
مصنف : ڈاکٹر اشرف آثاری
سائز : 23X36/16
سنہ اشاعت: 2018
صفحات: 228
لیزر ٹائپ سیٹنگ وسرورق : الفجر پرنٹرز موبائل:9419046211:
قیمت : 450/=
بہ اہتمام : نگینہ پبلیکیشنز ہوٹل شہنشاہ پیلس بلیوارڈ ڈلگیٹ سری نگر۔۱۹۰۰۰۱ (کشمیر)
ناشر : صبا پبلیکیشنز صدرہ بل، حضرت بل سری نگر (کشمیر)
تقسیم کار : ا۔صبا پبلیکیشنز صدرہ بل حضرت بل سری نگر۔190006
۲۔کتاب گھر گورنمنٹ پریس سری نگر۔ 190001
۳۔نگینہ پبلیکیشنز ہوٹل شہنشاہ پیلس بلیوارڈ ڈلگیٹ سری نگر۔190001
۴۔ہومیومیڈیکل ٹائمز انار کلی پلازہ گونی کھن گلی امیرا کدل سری نگر۔190001

اس اردو افسانوی مجموعے کا عنوان ''بلھا کیہ جانا میں کون؟'' پنجابی زبان کے مشہور ومعروف، سلسلہ قادریہ کے شاعر حضرتِ بلھے شاہؒ کے زباں زد ہر خاص وعام شعر سے لیا گیا ہے اور اس عنوان سے اس مجموعے میں پہلا افسانہ بھی شامل ہے۔ مصنف

انتساب

اپنے بہت ہی بہترین دوست

ایڈوکیٹ پیرزادہ شمس الدین مرحوم کی نذر

جنہیں حب رسول ﷺ اور غم آخرت

ہمیشہ آبدیدہ بنادیتا تھا شاید اس ایک وصف

نے انہیں حیات وممات کے اصل مقصد تک۔

پہنچا بھی دیا ہو۔۔، اور ہم ابھی تک۔۔۔۔۔؟

مصنف

ڈاکٹر اشرف آثاری کی دیگر مطبوعات

۱۔عصری ادب کے رنگ و آہنگ (۱)	تنقیدی مضامین و تبصرے
۲۔علامہ اقبال اور مرزائیت (دوسرا اضافہ شدہ ایڈیشن زیر ترتیب)	اقبالیات
۳۔افسانہ لکھ رہا ہوں	افسانوی مجموعہ
۴۔بلھا کیہ جاناں میں کون	افسانوی مجموعہ
۴۔ہومیو پیتھی اور نوجوانوں کے جنسی مسائل	طبِ ہومیو پیتھی
۵۔ہومیو پیتھی اور پراسٹیٹ	طبِ ہومیو پیتھی
۶۔ہومیو پیتھی اور دمہ	طبِ ہومیو پیتھی
۷۔ہومیو پیتھی اور برص	طبِ ہومیو پیتھی
۸۔ہومیو پیتھی اور گردوں کی پتھریاں	طبِ ہومیو پیتھی

زیر اشاعت کتب

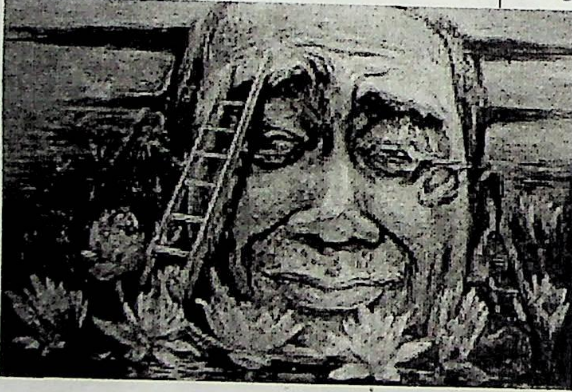
۱۔عصری ادب کے رنگ و آہنگ (۲) دوسرا حصہ

۲۔"صد رنگ" شعری مجموعہ

۳۔"خرافات" مزاحیہ مجموعہ کلام

رابطہ:۔نگینہ انٹرنیشنل ہوٹل شہنشاہ پیلس بلیوارڈ ڈلگیٹ سرینگر (کشمیر)

فہرست — صفحہ نمبر









'تن دہی اور Dedication سے قلم اٹھاتے ہیں'

پروفیسر حامدی کاشمیری

ڈاکٹر اشرف آثاری کے افسانوں کو پڑھنے کا موقع ملا ہے اور میں بلاتامل کہہ سکتا ہوں کہ ڈاکٹر اشرف آثاری پوری تن دہی اور Dedication سے قلم اٹھاتے ہیں، وہ اپنے عہد کے مسائل اور مشکلات کا پورا شعور اور آگہی رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک معاشرے میں طبقہ بندی اور سیاسی وسماجی اونچ نیچ گہرے مسائل کو جنم دیتی ہے، اور وہ جذباتی اور ذہنی ردعمل سے دوچار ہوتے ہیں، ڈاکٹر صاحب مظلوم اور فلاکت زدہ ہم وطنوں کو اپنا موضوع بناتے ہیں وہ یہاں کے موجودہ حالات سے بہت متاثر ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان تحریروں کو مروجہ افسانہ نویسی کے زمرے میں جگہ دی جاسکتی ہے اور کیا وہ افسانہ نویسی کے فنی لوازم کی تکمیل کرتے ہیں ؟ ظاہر ہے کہ کردار و واقعہ کے امتزاجی عمل سے ایک توجہ خیز اور تاثر پذیر صورت حال ابھرتی ہے، اور بنیادی طور پر حرف و بیان سے ایک تخیلی فضا قائم ہوجاتی ہے بلکہ ان کے کرداروں سے ذہنی اور جذباتی رشتہ قائم ہوجاتا ہے لیکن ڈاکٹر صاحب بیانیہ کی مدد سے افسانہ نویسی کا مقصد پورا کرنے کی ٹھان لیتے ہیں اور ان کے افسانوں میں کردار و واقعہ سے ایک رواں بیانیہ کا تاثر ابھرتا ہے، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب اپنی زندگی میں جو کچھ دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں، وہ ان کے عمل اور ردعمل کو جنم دیتا ہے اور ان کے افسانے توضیحی بیانیہ کا نمونہ بن کر سامنے آتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا بنیادی موقف یہ ہے کہ انسان اپنے انسانی اوصاف کے باوجود غیر انسانی فعل کا مرتکب ہوجاتا ہے، جیسے

افسانہ ''ماریا۔۔۔۔پانچ مشٹنڈوں کی ماں بہن'' میں کرداروں کی غیر اخلاقی عمل کے باوجود ان کے باطنی وجود کی تصویر نگاری سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سب میں پڑنے کے باوجود وہ مثبت کردار کا اشاریہ بن جاتے ہیں۔

میں پھر اپنے سوال پر آجاتا ہوں کہ کیا ان نگارشات کو مروجہ اور مسلمہ افسانہ نویسی کے زمرے میں جگہ دی جاسکتی ہے۔اس کا جواب یہ ہے کہ افسانہ میں کردارو واقعہ کے امتزاجی عمل سے ایک توجہ انگیز صورتِ حال ابھرتی ہے اور قاری کو اس کے کرداروں سے ذہنی اور جذباتی رشتہ قائم ہوجاتا ہے، اور کرداروں کے ذہن و دل کی واردات وکیفیات کو ابھارتے ہیں اس طرح وہ کردارو واقعہ کے عمل اور ردِ عمل سے ایک رواں بیانیہ کو جنم دیتے ہیں، اس طرح افسانہ قدیم کہانی کی اچھی صورت اختیار کرتا ہے، ڈاکٹر صاحب صنف افسانہ کی تقلید کرنے کے بجائے اپنے ذہن میں ابھرنے والے واقعات پر نطر رکھتے ہیں اور کہانی کے روپ میں پیش کرتے ہیں،

اس مجموعے میں شامل کئی افسانے اپنے اسلوب و بیان اور پلاٹ کی وجہ سے بہت جاندار اور اچھے ہیں جو ملک کے معروف اور معیاری اردو رسائل و جرائد جیسے آجکل'، 'شاعر' 'ایوانِ اردو' 'کتاب نما' اور 'انتساب' وغیرہ رسائل میں چھپ چکے ہیں اور پسند بھی کئے جاچکے ہیں۔

امید ہے ڈاکٹر اشرف آثاری اسی طرح تن دہی اور Dedication سے لکھتے رہینگے۔

پروفیسر حامدی کاشمیری

سابقہ وائس چانسلر یونیورسٹی آف کشمیر سری نگر

ڈاکٹر اشرف آثاری کے علامتی افسانے

نور شاہ

غوری پورہ لنک روڈ لل دید کالونی راولپورہ سری نگر

ڈاکٹر اشرف آثاری ریاستِ جموں کشمیر کے ان چند افسانہ نگاروں میں شامل ہیں۔ جن کے افسانے اردو زبان و ادب کے معیاری اور صف اول کے ادبی رسائل و جرائد میں اہتمام کے ساتھ چھپ رہے ہیں اور پسند کئے جا رہے ہیں اور ملک میں ہر جگہ پڑھے بھی جا رہے ہیں۔ ریاست سے تعلق رکھنے والے بہت کم افسانہ نگاروں کو ان رسائل تک رسائی ممکن ہو سکی ہے حالانکہ ان میں کئی سینئر اور تجربہ کار افسانہ نگار بھی شامل ہیں اگرچہ میں ذاتی طور پر چھپنے چھپانے کو معیار تسلیم نہیں کرتا لیکن اس بات سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا کہ کچھ رسائل اردو ادبی دنیا میں اپنی غیر جانبداری اور بلند معیار سے اپنا ایک ارفع مقام بنا چکے ہیں کہ ان میں چھپنا بذات خود ایک اعزاز سے کم نہیں ہے چھوٹے بڑے افسانہ نگاروں کی ان جیسے رسائل و جرائد میں چھپنے کی تمنا اور حسرت رہتی ہے ان رسائل میں چھپنے سے قارئین کا ایک وسیع حلقہ بھی میسر رہتا ہے اور ان کے تبصرے اور تاثرات جاننے کا موقع بھی ملتا ہے۔

خوشی کا مقام ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے افسانے 'ایوانِ اردو' کتاب نما اور آجکل جیسے رسائل میں بھی چھپ چکے ہیں اور ادبی حلقوں میں موضوعِ بحث بھی بنے رہے۔ ان رسائل میں چھپنا ایک بڑی بات ہے کیونکہ یہاں تخالیق کا زبردست رش رہتا ہے اور ایک ایک تخلیق کے معیار پر پورا اترنے پر ہی اشاعت کے لئے منتخب کر لیا جاتا

ہے اور نام سے زیادہ تخلیق کو اہمیت ملتی ہے۔

اشرف آثاری گو کہ ایک عرصہ سے افسانے لکھ رہے ہیں لیکن ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''افسانہ لکھ رہا ہوں'' کئی سال قبل ۲۰۱۴ء میں چھپ کر منظرِ عام پر آچکا ہے۔ جس میں کل ۳۵/افسانے ہیں جن میں ''دھویں کا ستون'' ''ملامت سے ملامت تک'' ''نئے افق کی تلاش'' ''من وتو'' ''فرار'' ''مراجعت'' ''تتر بتر شیرازہ'' اور ''ملاپ'' جیسے علامتی افسانیں بھی شامل ہیں۔ میں نے ان تمام افسانوں کا بڑی سنجیدگی سے مطالعہ کیا ہے حالانکہ علامتی افسانہ میرا موضوع نہیں رہا ہے۔ ان افسانوں کے مطالعے سے' بحیثیت ایک افسانہ نگار کے' جو میری رائے بن گئی ہے اس کا آزادانہ اظہار میں یہاں کر رہا ہوں اس بات کے باوجود بھی کہ اختلاف رائے کا حق ہر ایک کو حاصل ہے۔

جہاں تک اشرف آثاری کے علامتی افسانوں کا تعلق ہے۔ ان کے علامتی افسانے جاندار رمزو کنایہ اور علامتی اور استعاراتی بیانیہ سے آراستہ ہیں۔ بیانیہ زوردار اور متاثر کن افسانوں کی جان ہوتا ہے۔ جس سے ہر افسانہ نگار' زبان و بیان کی خوبیوں سے اپنے افسانے کو آراستہ اور تذ ین تو کرتا ہی ہے افسانے کے قاری کو بھی مسحور ومحظوظ کرتا ہے اور افسانوں کے پلاٹ پر بھی توجہ دی گئی ہے۔

موجودہ دور کا انسان اپنی شناخت کھو چکا ہے دنیاوی چمک دمک اور چکا چوند کر دینے والی روشنی نے اسے مادیت کی طرف مائل کر دیا ہے وہ اندرونی اور روحانی اقدار کی فرحت وآسودگی بخش حقیقت سے روز بروز دور ہوتا جاتا ہے۔ دنیاوی آرام وآسائش کے مایاجال میں وہ بری طرح سے پھنس چکا ہے۔ اس کے اطراف واکناف میں پھیلے ہوئے وقت کے سامری کے جادوئی پھندے ہیں جن میں وہ بری طرح سے الجھ چکا ہے اس کے اندر

روحانی حقائق اور ابدی سچائیوں کا شعور و احساس مر چکا ہے وہ کھرے اور کھوٹے میں تمیز کے فہم و ادراک سے بھی عاری ہو چکا ہے اس کے پاس نہ صاف وشفاف اور مخلص وہمدرد دل ہے نہ صالح عقل و ذہن ۔وہ اسطرح سیاسی، سماجی معاشی اور معاشرتی مسائل و الجھنوں میں الجھ چکا ہے کہ وہ اپنے اصل منصب ومقصد کو فراموش کر چکا ہے وہ نفس پرستی اور مجازی خداؤں کے چنگل میں پھنس کر دیوہیکل فرعونوں اور طاغوتوں کا مکمل غلام بن چکا ہے۔ جو اسے اپنی مرضی اور مقصد کے لئے استعمال کرر ہے ہیں اخلاق وآداب کا تصور اس کے ہاں معدوم ہو چکا ہے۔ اسکی اولین ترجیحات صرف اور صرف ذاتی مفادات ہیں۔ اس کے قول و فعل میں تضاد ہے اور کردار و عمل میں آلودگی و کثافت ہے۔ وہ ذہنی انتشار و خلفشار کا شکار بن چکا ہے اس کی ہمت جواب دے چکی ہے اور اس کا حوصلہ مرجھا چکا ہے اس کے اندر لاتعداد شکوک وشبہات، خوف وتشویش اور وسوسوں نے جگہ بنالی ہے اس کے اندر نہ یقین واطمنان کی رمق موجود ہے نہ اعتماد و بھروسے کی کرن ہی۔ اگر اس کے اندر کچھ ہے تو وہ صرف تضاد اور نفسیاتی الجھاؤ اور غیر یقینیت ولاابالی ہے اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے وہ اس عذاب وکرب کی صورتِ حال سے فرار چاہتا ہے ان دیکھی مسافتوں کی طرف جہاں یہ جہنم نہ ہوان کربناک مراحل سے اسے گذرنا نہ پڑے۔

ڈاکٹر اشرف آثاری کے افسانوی مجموعے ''افسانہ لکھ رہا ہوں'' میں کئی علامتی افسانے ہیں جو موجودہ دور کے انسان کے انہی اوپر مذکورہ معاملات و مسائل کی بھرپور عکاسی اور ترجمانی کرتے ہیں جو اس دور کی دین ہیں۔ مثلاً ان کا 'فرار' عنوان کا افسانہ ہی لے لیجئے۔ اقتباس

''مگر۔۔۔۔۔! 'فرار تو سراسر بزدلی اور بے غیرتی ہے؟''

نہیں نہیں، یہاں تمہاری رائے میری رائے سے مختلف اور الگ ہے۔ فرار بزدلی اور بے غیرتی ہرگز نہیں ہے؟۔ تم جانتے ہو، اچھی طرح سے جانتے ہو کہ اگر بلی، کتے کو اور چوہا بلی کو دیکھ کر فرار اختیار نہیں کرتا تو دوسرے ہی لمحے وہ دونوں ان کی ہوس کے شکار ہو جائیں گے۔ اگر ہم بجلی کے تار سے اپنے آپ کو الگ نہیں کریں تو دوسرے ہی لمحے بجلی کا کرنٹ ہمیں بے جان بنا دے گا، سڑک پر سائیکل سوار کا بھاگنا فرار ہے۔ دریا میں نشیب کی طرف بہتے ہوئے پانی کا بہنا فرار ہے۔ شیر کو دیکھ کر ہرن کا بھاگنا فرار ہے۔۔۔۔۔۔۔ اگر تم بھی ان لوگوں میں شامل ہو جو کسی لفظ کو اس کے لغوی مفہوم کے تناظر میں دیکھتے ہیں تو پھر میں تمہیں اپنا شاگرد نہیں کہہ سکتا۔۔۔۔۔۔۔؟"I

am really very sorry"

علامتی افسانوں میں افسانہ نگار رمز و کنایہ سے بات کرتا ہے جن میں بڑی گہرائی و گیرائی بھی ہوتی ہے اور معنویت و مقصدیت کی وسعت بھی۔ الفاظ و تراکیب اور استعاروں کی ہمہ جہتی، معانی و مفاہیم کے دروازے کھول دیتی ہے۔

انسان بہرحال انسان ہی ہے حیوان نہیں۔ جو اپنی وحشیانہ جبلتوں کے غلام ہوتے ہیں انسان میں کمزوریاں خامیاں اور نقائص بھی ہیں لیکن اپنے حواس خمسہ کا استعمال کر کے اپنی مخصوص و منفرد فطرت اور روحانی اوصاف و خصائل سے وہ بالکل بے خبر بھی نہیں ہے اسے نیک و بد کی پہچان و تمیز بھی ہے کھرے اور کھوٹے کی پہچان بھی ہے۔ زندگی کے ابدی حقائق سے وہ آخر کب تک بھاگتا رہے اور بھاگ کر بھی کہاں جائے؟ کہ فرار کسی مسئلے کا مستقل حل نہیں ہو سکتا۔ یہ بات بجا ہے کہ موجودہ اخلاقی تنزلی نے اسے پست درجے تک گرا دیا ہے ورنہ وہ اپنی عظمت و شانِ رفتہ سے خوب واقف ہے۔ اس کے دل

میں امیدیں اور امنگیں بھی ہیں جن کے سہارے وہ زندگی گزارتا ہے۔ ڈاکٹر اشرف
آثاری کے اسی ''فرار'' افسانے کے یہ آخری چند سطور بھی ملاحظہ فرمائیے۔ اقتباس
''پھر اس نے اپنی پوٹلی سر پر اٹھائی جونہی اس کی سہمی ہوئی نظریں
مشرق کی جانب اٹھیں اس نے دیکھا کہ دور، بہت دور، دودھ میں نہایا ہوا ننھا سا چاند اس
کی طرف بڑی متحیر نگاہوں سے، افق کے گھوڑے پر، سوار ہو کر، بڑی پیار بھری نگاہوں سے،
اسے جھانک رہا ہے اور اس کے استقبال کے لئے کھڑا ہے''

یہ فرار اور یاسیت سے امید کی طرف مراجعت ہے۔ جو ایک حوصلہ
افزاء صورتِ حال کی عکاسی بھی ہے اور امید و اطمنان کی نوید بھی۔

افسانہ نگاری ایک امیجری ایک فکشن نگاری ہے لیکن حقیقت نگاری بھی اس
کا لازمی جز ہے انسانی جذبات و احساسات کی بھرپور عکاسی اور صداقت بھی اس میں نظر
آتی ہے خواہشاتِ نفس اور انسانی اخلاقیات کے مثبت و منفی پہلو اور رجحانات بھی دیکھنے
میں آتے ہیں اتنے سارے خصائل و خوبیوں سے گندھا ہوا ادب لایعنی نہیں ہو سکتا ضرور
کسی مقصدیت کا قائل بھی ہوگا یا ترجمان بھی اس میں غیر مقصدیت یا لایعنیت کو کوئی جگہ
نہیں ہے ہاں یہ مقصدیت کسی واعظ کے وعظ والی مقصدیت نہیں ہو سکتی۔

ڈاکٹر اشرف آثاری اب ایک عرصہ سے افسانے لکھ رہے ہیں ان کے علامتی افسانے
بھی ان کے دیگر افسانوں کے طرح ہی معیاری اور متاثر کرنے والے افسانے ہیں۔

جس رفتار اور اعتماد کے ساتھ ڈاکٹر اشرف آثاری افسانے لکھ رہے
ہیں وہ انہیں بہت جلد اس مقام تک لیجائینگے جس کے وہ مستحق ہیں۔

میں ذاتی طور پر ان کی ذہانت، بیان و اسلوب، امیجری، وحدتِ تاثر اور

الفاظ ومحاورات کے برجستہ استعمال، اوزعصر حاضر کے جدید اردو افسانے کے تقاضوں کی آ گہی اور آ گاہی سے مطمئن ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ان کے قلم سے ایسے شاہکار افسانے تخلیق ہونگے جنہیں نہ صرف یاد رکھا جائے گا بلکہ وہ اردو زبان کے افسانوی ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ بھی بن جائینگے۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔

نور شاہ

ڈاکٹر اشرف آثاری

آپ ایک ہومیو پیتھک معالج ہیں۔ کشمیر یونیورسٹی سے عربی میں ایم اے کیا ہے۔ آپ کے افسانے اور تنقیدی مضامین رسائل واخبارات میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اردو کے ہفت روزہ ''سٹیٹ رپورٹر'' سے بھی وابستہ رہے ہیں۔ لیکن ان کا اہم کارنامہ مختلف رسائل میں شائع ہونے والے ان کے طبی مضامین ہیں جنہیں وہ اب کئی کتابوں پر مشتمل ایک سیریز کے تحت شائع کرر ہے ہیں۔

اقتباس:۔ جموں وکشمیر کے اردو مصنفین (۲۰۰۸ء ریاستی کلچرل اکادمی سری نگر)

کہانی کے فن سے بخوبی واقف کہانی کار ڈاکٹر اشرف آثاری

ڈاکٹر اشرف آثاری کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔انہوں نے تنقید ،افسانہ، خاکہ، مذہب اور طب جیسے موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے۔آپ شاعر بھی ہیں۔ان کے کلام میں بڑی تاثیر ہے۔

ایک کہانی کار کی حیثیت سے ڈاکٹر اشرف آثاری نے کم مدت میں اپنا مقام بنایا ہے۔'آج کل' 'شاعر' 'ایوانِ اردو' اور تحریرِ نو جیسے موقر جرائد میں ان کی کہانیاں شائع ہوئی ہیں۔

ڈاکٹر اشرف آثاری کہانی لکھنے کے فن سے بخوبی آگاہ ہیں۔ان کی کہانیوں کے ابتدائی سطور قاری کی توجہ کھینچ لیتے ہیں۔کہانی خوبصورتی اور تسلسل سے کلائمکس کی طرف رواں دواں ہوتی ہے اور اختتام سے پہلے قاری کو سسپنس میں ڈال دیتی ہے۔اس کا منطقی انجام چونکا دیتا ہے۔کہانی کی یہ خصوصیات ایک کامیاب افسانہ نگار کی نشان دہی کرتی ہے۔

کشمیر کے پرآشوب حالات سے خاص کر ایک حساس کشمیری ادیب کا مفر ممکن نہیں ہے۔اشرف آثاری کی کہانیوں میں ان کا دردناک عکس ملتا ہے اور قاری ایک دکھتے دل کی آہ اور درد کو محسوس کرتا ہے۔"کتے دہشت گرد نہیں ہوتے؟" اور "گمنام قبرستان" اس ضمن کی دو کہانیاں ہیں۔

ڈاکٹر اشرف آثاری کی کہانیاں حقیقت نگاری اور مقصدیت کا امتزاج ہیں۔یہ خوبی ایک کہانی کی افادیت کو دوبالا کرتی ہے۔

۸رمارچ ۲۰۱۶ء عبدالغنی شیخ لداخی سری نگر موبائل۔ 9419840050

ڈاکٹر اشرف آثاری ایک معتبر قلمکار

حسن ساہو

اشرف آثاری صاحب کثیر الصفات شخصیت ہیں۔ بحیثیت شاعر، افسانہ نگار، تبصرہ نگار، نقاد اور طنز و مزاح نگار کے انہوں نے قابلِ تعریف مقام دنیائے علم و ادب میں حاصل کرلیا ہے۔ کاغذ داغدار کرنے کے ساتھ ساتھ اشرف صاحب ہومیو پیتھک طریقہ علاج کے اونچے پائیدان پر براجمان ہونے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

باوقار شخصیت اور بھر پور علمیت کے باوجود خوش خلقی ڈاکٹر صاحب کا شیوہ رہا۔ سیاسی، سماجی، مذہبی، ادبی، علمی اور ثقافتی غرض ہر شعبۂ فکر میں اپنی تحریر کے سکے جمادئے۔ طرزِ بیان میں رنگارنگی ہو اور محاورات کے برجستہ استعمال نے ان کی تحریروں میں لطافت پیدا کردی ہے۔

لہجہ کی شائستگی، عبارت کی رعنائی اور الفاظ کی نوک پلک قابلِ تحسین ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے افسانے براہِ راست زندگی سے گفتگو کرتے نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں کے کردار غیر مانوس نہیں لگتے۔ دراصل وہ زندگی کے تلخ و شیرین حقیقت کو خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ادبی محاسن کے گہرے مشاہدے کے بعد وہ افسانے کے خدو خال مرتب دیتے ہیں۔ معاشرے میں موجود عیوب و نقائص کو بے باکی سے ایک سلجھے فن کار کی طرح قارئین کے روبرو اجاگر کرنے کی نہ صرف کوشش کرتے ہیں بلکہ برائیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا عملی پیغام بھی دیتے ہیں۔

اشرف آثاری کے افسانے، اشعار اور مضامین زیادہ تر ریاستی عوام کی مجبوری و بے بس زندگی کی صحیح عکاسی کرتے ہیں۔ ان کے دردمند دل میں سے عزم کی دھیمی

دھیمی آنچ نثر و نظم کی شکل میں ڈھل کر وقت کے ستائے افراد کو ایک نیا عزم و حوصلہ عطا کرتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ فرقہ واریت، کدورت و منافرت پھیلانے والوں اور پراگندہ ماحول کو ہوا دینے والوں کے خلاف ڈاکٹر اشرف آثاری کا قلم اعلانِ جنگ ہے۔

پہلے افسانوی مجموعہ "افسانہ لکھ رہا ہوں" کے تمام افسانے ٹیکنیکی اعتبار سے مکمل کہے جا سکتے ہیں۔ افسانوں میں حسن اور کہانی پن برقرار رکھنے کی ممکنہ کوشش کی گئی ہے ہر افسانہ اپنے اصلی خدوخال کے ساتھ موجود ہے۔ اشرف آثاری کے مشاہدے کی آنکھ بہت تیز ہے۔ جو کچھ اس معاشرے میں دیکھا، پرکھا اور محسوس کیا اسے اپنے افسانوں یا اشعار کا موضوع بنایا۔

الغرض ڈاکٹر صاحب کی ادبی اور علمی صلاحیتوں کا ملک کے معروف قلمکاروں نے کھل کر اعتراف کیا ہے۔

طنز و مزاح کی صنف میں ڈاکٹر صاحب نے اچھی خاصی شاعری کی ہے اور ان کی متعدد نظمیں مختلف اخبار و رسائل میں شائع ہو کر ادبی و علمی حلقوں میں کافی دھوم مچا چکی ہیں۔ امید کرتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب اپنے مزاحیہ کلام کو بھی شائع کرنے کا اہتمام فرمائینگے۔

اس قدر معروف زندگی گذارنے کے باوجود ڈاکٹر صاحب بین الاقوامی معیار کے جریدے "نگینہ انٹرنیشنل" کے اراکینِ مجلسِ مشاورت میں ایک اہم رکن کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دینے میں پیش پیش ہیں۔

آخر میں اللہ تعالیٰ سے دست بدعا ہوں کہ عزیزی ڈاکٹر اشرف کو نظر بد سے محفوظ رکھے اور ان کا قلم اسی طرح بے باکی کے ساتھ اپنی جولانیاں دکھاتا رہے۔ آمین

حسن ساہو الحسنات، ہمدانیہ کالونی بمنہ سری نگر۔ موبائل۔ 9906439491

ڈاکٹر اشرف آثاری میری نظر میں

وحشی سعید (چیف ایڈیٹر نگینہ انٹرنیشنل سری نگر)

۲۰۱۲ء میں اردو اکادمی کی ایک تقریب ہوٹل شہنشاہ میں کسی کتاب کی اجراء کے سلسلے میں منعقد ہوئی۔ اسی تقریب میں نور شاہ صاحب نے میرا تعارف ڈاکٹر اشرف آثاری سے کرایا۔ ان کے ساتھ میری یہ ملاقات ایک عظیم سعادت ثابت ہوئی۔ جب میں نے نگینہ انٹرنیشنل کا از سرِ نو اجراء کا ارادہ کیا تو میری درخواست پر ڈاکٹر اشرف آثاری نگینہ انٹرنیشنل کے اراکین میں شامل ہو گئے حالانکہ ڈاکٹر اشرف آثاری عمر میں مجھ سے چھوٹے ہیں لیکن علمی ذہانت میں مجھ سے بہت آگے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت میں کئی شخصیتیں پوشیدہ ہیں ان کی شخصیت کا ہر پہلو علمی اور ادبی بصیرت و بصارت سے مالا مال ہے اور تخلیقی وسعتوں کا غماز بھی۔ شاعر بھی ہیں، افسانہ نگار بھی، محقق بھی ہیں اور ناقد بھی اور صحافت سے بھی ان کو دلچسپی رہی ہے سب سے بڑھ کر ایک اچھے انسان بھی ہیں۔ ایک ڈاکٹر ہونے کے ناطے یہ اپنے کرداروں کی نبض سے بخوبی آشنا بھی ہیں ان کی شعری اور نثری تخلیقات میں زندگی کے صحت مند عناصر پوری قوت کے ساتھ ابھرتے ہیں اور پڑھنے والوں کو متاثر کرتے ہیں۔

ڈاکٹر اشرف آثاری ایک باشعور قلم کار ہیں اور ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے ان کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ یہ زندگی کے چھوٹے بڑے اور دلچسپ واقعات کو افسانوی روپ دے کر اپنے تخلیقی اظہار کا وسیلہ بناتے ہیں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے مسرت ہو رہی ہے کہ ڈاکٹر اشرف آثاری موجودہ دور کے حساس اور باحوصلہ افسانہ نگاروں میں ہیں۔ ان کے افسانوں میں ایک جانب کشمیر کی خوبصورتی نظر آتی ہے تو دوسری جانب کشمیر کے موجودہ پر آشوب دور کے حالات و واقعات کی صاف گوئی سے عکاسی بھی نظر

آتی ہے۔ ان کے تجربات و مشاہدات وسیع ہیں اور تخلیقی و تحقیقی چراغوں سے روشن و منور بھی، موضوع کا انتخاب کرتے وقت زبان و اسلوب کا خاص خیال رکھتے ہیں الفاظ کے مناسب استعمال کو ترجیع دیتے ہیں۔ ان کو سماجی زندگی کا گہرا مطالعہ ہے۔ یہ صداقتوں کے ایسے تیر چلاتے ہیں کہ قارئین و سامعین کی آنکھوں میں آنسو ٹھہر نہیں پاتے؟
مجھے اس بات کا فخر ہے کہ ڈاکٹر صاحب جیسی قدآور ادبی شخصیت میرے رفیق بھی ہیں اور دوست بھی۔

والسلام
وحشی سعید (چیف ایڈیٹر نگینہ انٹرنیشنل سری نگر)

چند تاثرات محمد اسد اللہ وانی کے

اشرف آثاری کا نئے افق کی تلاش تمثیلی، تجریدی اور جدیدیت کا حامل افسانہ ہے۔ اس افسانے سے افسانہ نگار کے ان تجربات کی نشاندہی ہوتی ہے۔ جہاں لوگوں کی بھیڑ میں بھی اسے شدید تنہائی کا احساس ہوتا ہے۔ جہاں وہ اپنی ہر شئی بلکہ اپنا آپ تک کھو بیٹھا ہے اور اسے اس کی ازسرِ نو تلاش ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ فنکار موجودہ ماحول سے فرار کا راستہ اختیار کر کے کہیں گوشہ نشینی اور صوفی کی زندگی نہ گذارنے لگے؟ جس میں اس کی بقاء اور سالمیت پنہاں ہے۔

(اقتباس۔ ''جموں و کشمیر میں اردو افسانہ'' مطبوعہ ''تعمیر'' انتخاب نمبر اگست ۱۹۹۹ء تحریر محمد اسد اللہ وانی شعبہ اردو گورنمنٹ ڈگری کالج بھدرواہ (ڈوڈہ)

ڈاکٹر اشرف آثاری کا افسانوی کینوس

عبداللہ خاور

عمر کالونی' لال بازار سری نگر (کشمیر) پن کوڈ۔ ۱۹۰۰۰۶

ڈاکٹر اشرف آثاری ہماری وادی کے معروف ادیب و شاعر اور نقاد ہیں۔ ان سے میرے مراسم چار دہائیوں پر محیط ہیں۔ میں انہیں شاعر کی حیثیت سے جانتا ہوں۔ ان کی غزلیہ شاعری بڑی طرح دار ہے۔ ان کے تنقیدی ذہن سے بھی آشنا ہوں۔ ان کی غزلیں اور مقالے ملک کے مقتدر رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ مجھے ان کی مقالہ نگاری نسبتاً زیادہ پسند ہے کہ یہ جب بھی کوئی مقالہ لکھتے ہیں تو موضوع کی ہر جہت پر ان کی نگاہ ہوتی ہے۔ ان سے اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن ان کے خلوص پر شک نہیں کیا جاسکتا ہے۔ پچھلے دنوں انہوں نے اپنا افسانوی مجموعہ "افسانہ لکھ رہا ہوں" میرے ہاتھ میں تھما دیا تو مجھے خوشی سے زیادہ حیرانی ہوئی کہ افسانہ نگار کے طور پر میں انہیں قطعی نہیں جانتا تھا۔

"افسانہ لکھ رہا ہوں" اڑتیس افسانوں کا مجموعہ ہے۔ یہ افسانے جیسا کہ انہوں نے خود لکھا ہے۔ افسانہ نگار کے ساتھ پیش آئے واقعات یا حادثات کا نتیجہ ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ایک حقیقت کو جب افسانوی روپ دیا جاتا ہے تو اسکی تاثیر میں کوئی شبہ نہیں رہتا اور اگر اسے خوبصورت اسلوب میں پیش کیا جائے تو یہ تاثیر دو چند ہو جاتی ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اشرف آثاری نے یہ دونوں چیزیں بڑی خوبصورتی کے ساتھ استعمال کی ہیں۔ ان افسانوں کو پڑھکر مجھے ایسا احساس ہوا کہ آثاری صاحب' حرکت اور زندگی کے دلدادہ ہیں۔ ان کے افسانے پڑھ کر جمود سے نفرت کا اظہار ملتا ہے۔

ہماری وادی' پچھلی تین دہائیوں سے' پر آشوب حالات سے گزر رہی ہے۔ ان حالات سے پیدا شدہ مسائل آثاری صاحب کے زیرِ نظر مجموعے کے کئی افسانوں کے موضوع بنے ہیں۔ ان مسائل کی عکاسی بڑی چابکدستی اور فن کارانہ انداز سے کی گئی

ہے۔افسانے "وہ کون تھا"، "گم نام قبرستان"، "واپسی"، "دشمن کی بیٹیاں" وغیرہ۔اس قبیل سے تعلق رکھتے ہیں۔

"ابو کی زبان سے یہ سب کچھ سن کر میں حیران وششدر رہ گئی۔میں کچھ کہہ نہیں پارہی تھی۔ بالکل ایسے' جیسے سب الفاظ میرے حلق میں اٹک کر رہ گئے ہوں۔سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی جیسے جواب دے چکی ہو۔سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ کہ کل رات جو ہمارے گھر رہے وہ کون تھے۔۔۔۔۔؟؟!!" (اقتباس "وہ کون تھا؟"

"یہاں تک پہنچتے پہنچتے قادر نے ضبط سے کام لیا کہ اس کی گفتگو اور رندھی ہوئی آواز سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ جیسے اس کی زبان' شیشے کی نوکدار کرچیوں کے اوپر گھس گھس اور رگڑ رگڑ کر' اپنا گفتگو کا سفر جاری رکھے ہوئے ہے اور الفاظ اور جملے گھسیٹ گھسیٹ کر منہ سے باہر آرہے ہیں۔لیکن اس کے فوراً بعد ہی قادر اپنے لب و لہجے پر قادر نہ رہا' نہ وہ گفتگو کو ہی جاری رکھ سکا۔البتہ اس کی گفتگو زاروقطار رونے اور سسکنے میں تبدیل ہوگئی۔اس کی کمزور وضعیف بصارت والی ناتواں آنکھوں سے' آنسوں کی ایک دھارسی بہنے لگی۔اس کی لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے' میں یہ چند جملے ہی سمجھ پایا۔"اصغر نے خط پر اپنا پتہ نہیں لکھا تھا۔اگر لکھا ہوتا؟ تو میں اس سے پوچھ لیتا کہ خدارا' ہمیں بتاؤ؟ کہ تم نے ہمارے بیٹے مختار کو کہاں اور کس گمنام' قبرستان میں چھپا رکھا ہے؟ تاکہ میں اور زبیدہ بھی'۔۔۔۔۔اسی۔۔گمنام۔۔۔قبرستان میں۔۔۔دو گز زمین۔۔۔۔۔حاصل کرلیتے۔۔۔۔؟؟!!" (اقتباس "گمنام قبرستان")

افسانہ نگار نے اخلاقیات کو بھی اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔"پرایا دل" "یوز اینڈ تھرو" "ملاپ" "عنوان نہیں سوجھتا" وغیرہ افسانوں میں اخلاقی برائیوں کی نشاندہی بڑی عمدگی سے کی گئی ہے۔سماجی برائیوں کی بات کریں تو آثاری صاحب نے "پریگیٹ سنگھ" "ہم سا برا نہ کوئی" "خود کشی" "سبیلہ" وغیرہ جیسے افسانوں میں سماجی

برائیوں کی تہہ میں غوطہ لگا کر ان کا پتہ لگایا ہے۔ مثلاً ''سبیلہ'' میں ایک عورت جب دوسری بیٹی کو جنم دیتی ہے تو ایک انجانے خوف (جسے ہم سماجی خوف کہہ سکتے ہیں) سے موت کو گلے لگاتی ہے۔ ''اس خیال نے' کہ کہیں دو دن کی سبیلہ ماں کو دیکھے اور اس کا دودھ چکھے بنا ہی' اس سے نا کہاں بچھڑنے پر' اسے ڈھونڈہ تو نہیں رہی ہے؟ جسے ہم کل ہی منوں مٹی کے نیچے دفن کر کے آئے ہیں' میرے آنسوں کے بے کنار سمندر کو پوری کائنات تک پھیلا دیا۔۔۔۔۔!!'' (اقتباس ''سبیلہ)

یا ''ہم سا برانہ کوئی'' میں ایک ڈاکٹر کو معائنہ کے دوران اپنی بیوی کی کوکھ میں جڑواں بچیوں کا پتہ چل جاتا ہے تو وہ ان معصوموں کا شکمِ مادر میں ہی خاتمہ کرا دیتا ہے ۔آثاری صاحب نفسیاتی مسائل اور ان کی باریکیوں پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ جس کا اظہار ان کے کئی افسانوں میں ملتا ہے۔ ''نئے افق کی تلاش'' ''من وتو'' ''بندر بڑے یا ریچھ'' ''کٹھ پتلی'' ''پھانس'' وغیرہ افسانوں میں نفسیاتی مسائل پر فنکارانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ خاص کر افسانہ ''پھانس'' میں جو نفسیاتی نکتہ ابھارا گیا ہے۔ وہ دل چسپ بھی ہے اور توجہ کا متقاضی بھی۔ ''میں ہر صبح گھر سے باوضو نکلتا ہوں اور اکثر میری آنکھیں' بس میں دورانِ سفر نم ہی رہتی ہیں اور زبان مسلسل اور متواتر۔۔۔۔۔ الھم صلی علی سیدنا محمدٍ نبی الامی وعلی آلہ واصحابہ وسلم۔۔۔۔ کا ورد کرتی رہتی ہے۔ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے جواب دیا۔ ۔۔۔ ہر شخص کو اپنے بارے میں لاتعداد غلط فہمیاں ہو سکتی ہیں۔ میری چھوڑئیے میں آپ ہی سے پوچھتا ہوں کہ کیا میں واقعی ظاہری طور پر اس قدر برا' بد باطن اور گیا گزرا دکھتا ہوں کہ میرے بارے میں اسطرح کی رائے قائم کی جا سکے؟ یا توقعات وابستہ کئے جا سکیں؟'' میری آواز رندھی ہوئی تھی اور الفاظ میرے حلق میں جیسے اٹک رہے تھے اور آنکھیں بھی۔۔۔۔۔۔۔۔؟؟!!'' (اقتباس ''پھانس'')

افسانوی مجموعے میں دو افسانچے بھی شامل ہیں۔ دونوں کا لہجہ طنزیہ ہے اور

غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں ۔ یہ کتاب حکومت جموں و کشمیر سے منسلک جموں اینڈ کشمیر
اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز کے جزوی مالی تعاون اور جموں کشمیر اردو اکادمی کے اہتمام سے، خوبصورت چھپی ہے ۔ البتہ پروف ریڈنگ کی طرف ذرا کم توجہ دی گئی ہے ۔ کافی غلطیاں کتابت کی رہ گئی ہیں ۔ مثلاً ایک افسانے کا عنوان ''آک تھو'' تحریر ہوا ہے ۔ جبکہ متن میں ہر جگہ صحیح لفظ 'آخ تھو' ہی تحریر ہوا ہے اسی طرح 'بالآخر' جیسے الفاظ ہیں وغیرہ ۔ جب اس ضمن میں مصنف سے استفسار کیا گیا تو انہوں نے معقول وجہ یہ بتائی کہ مکمل پروف ریڈنگ والا مسودہ کمپیوٹر کمپوزر کو' غلطیاں درست کرنے کے لئے سونپا گیا تھا لیکن اس کی مکمل یقین دہانی کے بعد ہی کتاب اشاعت کے لئے بھیج دی گئی تھی لیکن بعد میں کتاب چھپ کر آنے پر پتہ چلا کہ انتہائی تاکید کے باوجود بھی' غلطیاں درست نہیں کی گئی ہیں ۔ اسلئے کتاب کے ساتھ اغلاط نامہ پیسٹ کرنا پڑا ۔

ڈاکٹر اشرف آثاری کے افسانوی مجموعہ پر اردو افسانوی ادب کے دوسر برآوردہ اور کافی تجربہ کار افسانہ نگاروں' نور شاہ اور عبدالغنی شیخ لداخی نے اپنی گرانقدر آرا کا اظہار کیا ہے ۔ نور شاہ صاحب رقمطراز ہیں کہ

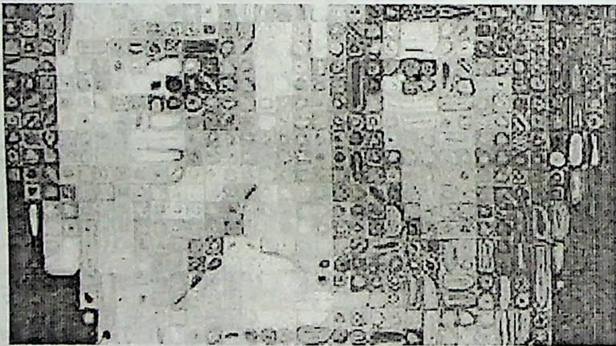
''ڈاکٹر اشرف آثاری کا افسانہ لکھنے کا اپنا ایک منفرد انداز اور اسٹائل ہے جو دوسروں سے مختلف بھی ہے اور الگ بھی ۔ ان کا لب ولہجہ پسند کیا جا رہا ہے ۔ ڈاکٹر صاحب حالات وواقعات کی منظر کشی بڑے عمدہ انداز میں کرتے ہیں ۔''

عبدالغنی شیخ لداخی لکھتے ہیں کہ ''اشرف آثاری صالح ادب پر یقین رکھتے ہیں وہ فحش نگاری کے خلاف ہیں اور روحانی اور اخلاقی قدروں کا پاس رکھتے ہیں ۔ علماء نے اسے اسلامی ادب کا بھی نام دیا ہے ۔

میں پھر ایک بار یہ بات یہاں دھرا رہا ہوں کہ آثاری صاحب کے ساتھ میرے دیرینہ مراسم ہیں اور میں انہیں اچھی طرح سے جانتا ہوں صالح اور صاف ستھری زندگی

گذارتے ہیں اور تخلیقی اور تحقیقی صلاحیتوں سے آراستہ ہیں اورصافِ باطن و پاکیزہ خیالات رکھنے والے ایک اچھے انسان ہیں، ظاہر بات ہے کہ ان سب خوبیوں کا اثر ان سے تخلیق ہونے والے ادب پر بھی لازمی طور پر ہونا چاہیئے۔

عبداللہ خاور
عمر کالونی' لال بازار سری نگر (کشمیر)
پن کوڈ۔۱۹۰۰۰۶





پہلی ہی کوشش، ایماندارانہ اور مخلصانہ

دیپک بدکی

شاعر، افسانہ نویس، نقاد و تبصرہ نگار ڈاکٹر اشرف آثاری ۱۴؍اپریل ۱۹۵۴ء کو حضرت بل، کشمیر میں ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے۔ محنت و مشقت، قناعت اور صبر وشکر ان کی شخصیت کے اہم جز و بن گئے۔ والد کشمیری زبان میں شاعری کرتے تھے۔ اس طرح ادب وراثت میں ملا۔ میٹرک پاس کر کے ایک سرکاری محکمے میں ملازم ہو گئے اور ملازمت کے دوراں ہی پوسٹ گریجویشن کی ڈگری حاصل کر لی بقولِ اشرف آثاری ان کا پہلا افسانہ مقامی اخبار روزنامہ 'آفتاب' میں ۱۹۷۲ء کے آس پاس چھپا ہے۔ بعد میں آثاری کے افسانے نہ صرف مقامی بلکہ ریاست سے باہر بھی اخبارات اور رسائل میں چھپتے رہے اور وہ ریڈیو اور ٹی وی کے پروگراموں میں بھی حصہ لیتے رہے۔ چنانچہ شاعری اور افسانہ نگاری ہر دو کے ساتھ شغف تھا اس لئے موضوع کے اعتبار سے وہ فیصلہ کرتے تھے کہ کس صنف میں اس کا اظہار کرنا چاہئے۔ اس بارے میں فرماتے ہیں کہ "تخلیق کار یہ فیصلہ خود ہی کرتا ہے کہ اس کے اندر پیدا ہونے والے فکر و احساس کو وہ کیسے موثر اور کارآمد ذریعہ اظہار دے سکتا ہے یا پھر اپنے فکر و خیال کو وہ کس فنی سانچہ یا صنف میں ڈھال کر یادگار بنا سکتا ہے۔" مصنف کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں جب کہ چند ایک اشاعت کے مراحل سے گذر رہی ہیں۔ ڈاکٹر اشرف آثاری ایک سہ ماہی جریدے 'ہومیومیڈیکل ٹائمز' کی ادارت سے بھی وابستہ ہیں۔

'افسانہ لکھ رہا ہوں' میں ۲۵؍افسانے شامل ہیں اور پیشِ لفظ کے علاوہ

نورشاہ اور عبدالغنی شیخ لداخی کے تاثراتی مضامین بھی شامل ہیں۔ڈاکٹر اشرف آثاری کے یہاں گونا گوں سماجی، سیاسی اور نفسیاتی موضوعات ملتے ہیں جوان کے پاس پڑوس کے ماحول کی خوب ترجمانی کرتے ہیں۔ بقول افسانہ نگار کے ہی، ان کے کچھ افسانے رسالہ 'شب خون' کے مسلسل مطالعے کے سبب جدید رنگ اختیار کر چکے ہیں۔ جب کہ اکثر و بیشتر انفرادی طور پر پیش آئے واقعات و حادثات پر مبنی ہیں۔اس لئے روائتی بیانیہ انداز میں رقم کئے گئے ہیں۔انسانی نفسیات پر مبنی افسانہ، ملامت سے ملامت تک' بڑی خوبصورتی سے انسانی دوشاخہ شخصیت کے تضاد کو منعکس کرتا ہے۔'یادوں کے دفتر' میں موجود دوڑتی بھاگتی زندگی میں چند فرصت کے لمحات کی تلاش میں بھٹکے انسان نظر آتے ہیں۔'پھانس' اور'پھانس۔ ۲' نفسیاتی گرہوں کو کھولتی ہوئی اغلام بازی پر لکھی گئی کہانیاں ہیں جن میں مختلف طبقوں میں پھیلی اس جنسی کجروی کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔دیگر افسانوں کے موضوعات یوں ہیں۔'نئے افق کی تلاش' (تجسس اور اڈان)، آخ تھو (رشوت خوری)، 'افسانہ لکھ رہا ہوں' (ایمانداری رزمانہ سازی)، من وتو (بچھڑنے کا غم)، 'بندر بڑے یا ریچھ' (انسانی زندگی کے خلاف حیوانی زندگی کو ترجیح)، 'کٹھ پتلی' (خالق، تخلیق کا مسئلہ) پریگیٹ سنگھ (ایمانداری)، یوز اینڈ تھرو (ایلون ٹوفلر کے فلسفے، پھینک دو کلچر پر مبنی)، 'فرار' (زندگی سے بھاگنے کی سعی)، 'ہم سا برانہ کوئی' (جنین کشی) 'مہمان' (درویشوں پر اعتقاد)، 'مراجعت' (خدا کی دی ہوئی نعمتوں کا صحیح استعمال)، 'تتر بتر شیرازہ' (عالمی تناظر میں جنگ و امن کا تقابل)، 'قدسیہ' (انسانی حرص و طمع کی انتہا)، 'دادی اماں۔۔۔' (ایک مخلص خود کفیل بڑھیا کی کہانی)، 'سبیلہ' (بن ماں لڑکی کا مستقبل)، 'خود کشی۔۔؟' (سینما کا اثر)، 'تہجد' (منضبط و بے ضبط زندگی کا

تقابل)، 'میں۔۔۔؟' اور 'بھگوان سو گیا' بھی کتاب میں شامل کئے گئے ہیں۔

کشمیر گذشتہ ستائیس برسوں سے جس دور سے گذر رہا ہے اس سے سبھی کشمیری متاثر ہو چکے ہیں۔ وہ چاہے مقامی بسکین ہوں یا پھر مہاجر جو وادی چھوڑ کر دوسری جگہوں پر جا بسے۔ مہاجروں کو جن حالات سے گذرنا پڑا اس کا اثر بہت برسوں رہا جب تک ان کی جڑیں دوسری زمینوں میں پیوست ہو گئیں۔ ہاں ایک پوری نسل جس کی زندگی کا بیشتر حصہ کشمیر میں گذرا تھا۔ اب بھی ان یادوں کو سینے سے لگائے بیٹھے آٹھ آٹھ آنسو رو رہے ہیں افسانہ نگار نے مہاجروں کے حوالے سے چند کہانیاں رقم کی ہیں۔

وادی میں رہ رہے اور نامساعد حالات سے جوجھ رہے لوگوں کے کرب کی کہانیاں ہیں۔ ظاہر ہے کہ وادی کے قلم کاروں کے دکھ درد کو قرطاس پر مسلسل انڈیل رہے ہیں اور ڈاکٹر آثاری نے بھی اس ضمن میں چند ایک خوبصورت کہانیاں قلم بند کی ہیں۔ افسانہ 'وہ کون تھا؟' میں غیر مساعد حالات میں انسانی بے بسی کی عکاسی کی گئی ہے اور اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جس کا کوئی نہیں اس کا خدا ہوتا ہے۔ 'گمنام قبرستان' ایک بہت ہی دلگداز افسانہ ہے۔ جس میں بستی سے گم ہونے والے نوجوانوں کے والدین کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ 'میرا بیٹا زندہ ہے' ایک نیک اور ہمدرد بچے کی کہانی ہے۔ جو گرنیڈ حملے کی زد میں آ کر موت اور زیست کے درمیان کئی روز لٹکا رہتا ہے۔ افسانہ نگار اس افسانے میں لکھتے ہیں کہ "آپ نے سچ فرمایا! آج کے اس کل یگ میں سب سے زیادہ پریشان نیک اور خدا ترس لوگ ہی ہیں اور جو بد اور برے ہیں وہ موج مستی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔" اسی طرح 'ملاپ' ایک واقعاتی کہانی ہے جو کشمیر میں ۸/ اکتوبر ۲۰۰۵ء کو آئے زلزلے کی تباہی کی عکاسی کرتی ہے۔ مگر یہ کہانی رپوتاژ سے آگے

نہیں جا پائی ہے۔ کشمیر سے متعلق افسانوں میں خوف و دہشت کی دلسوز منظر نگاری دل پر اثر کرتی ہے۔ ملاحظہ ہو چند اقتباسات:

''مجھے وہ دن اچھی طرح سے یاد ہے، جب رات کے اندھیرے میں انجانے لوگوں نے حاجی صاحب کو گھر کے صحن میں محض اس لئے کلاشنکوف کی گولیوں سے شہید کر دیا کہ وہ ان کو مطلوبہ رقم، جو کافی موٹی رقم تھی، نہ دے سکے تھے۔'' ('یادوں کے دفتر' صفحہ ۳۰)

''بیٹا رات بھر میں انتہائی پریشان رہا، حالات کافی خراب ہو گئے تھے۔ ہم لوگ آفس سے باہر بھی نہ نکل سکے، پورا علاقہ ملٹری کے گھیرے میں رہا، رات بھر فائرنگ ہوتی رہی۔ تمہاری فکر نے دو پل بھی مجھے اطمنان سے بیٹھنے نہ دیا۔ کتنے وسوسے اور اندیشے پیدا ہو رہے تھے۔ صبح سویرے کریک ڈاون میں ذرا سی نرمی ہوتے ہی بھاگتا دوڑتا ہوا یہاں کی طرف لپکا، کافی تھکا ہوا ہوں۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تم لوگ صحیح سلامت ہو اور خیریت سے ہو۔''

افسانوں کی تکنیک کے بارے میں مصنف خود ہی اعتراف کرتے ہیں کہ ''میں نے سنجیدگی سے کئی بار اپنی ان تحریروں کا مطالعہ کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ کہانی، افسانہ اور انشائیہ کے مابین تکنیکی اور فنی حد بندیوں کو کہیں کہیں قائم نہ رکھ سکا ہوں جیسے پھانس۔ ۲، بندر بڑے یا ریچھ؟ وغیرہ میں، جس سے فن افسانہ کی جمالیات متاثر ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔'' ان کے اسلوب پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے نور شاہ اپنے مضمون بہ عنوان ''منفرد و مخصوص اسٹائل کا افسانہ نگار'' میں لکھتے ہیں کہ ''پھانس پڑھ کر ایک بار پھر مجھے یہ احساس ہوا کہ افسانہ لکھنے کا ان کا اپنا ایک اسٹائل ہے جو دوسروں سے مختلف اور الگ ہے۔

'پھانس' میں انہوں نے جس موضوع کو افسانوی رنگ وروپ دیا ہے وہ بہت ہی نازک اور سنجیدہ ہے اور آج کی بے راہ روی کی ایک زندہ مثال ہے۔ افسانے کے پس منظر میں زندگی کا جو المیہ ہے وہ اس افسانے کو برتری بخشتا ہے۔''

جہاں تک زبان کا تعلق ہے ان افسانوں میں سلاست اور عام فہمی نظر آتی ہے املا اور گرامر کی غلطیاں رہ جانے پر ایک اغلاط نامہ بھی جوڑ دیا گیا ہے امید ہے ان اغلاط کا ازالہ دوسرے ایڈشن میں کیا جائے گا۔

مجموعی طور پر مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ ڈاکٹر اشرف آثاری کی یہ پہلی کوشش بہت ہی ایماندارانہ اور خلوص سے بھرپور ہے اور مجھے امید ہے کہ اس کی اردو حلقوں میں پذیرائی ہوگی۔ اس کے علاوہ میں ڈاکٹر اشرف آثاری سے اور بھی اچھے افسانوں کی امید کرتا ہوں۔

دیپک بدکی

اے۔۱۰۲، ایس جی ایمپریشن، سیکٹر ۴۔بی، وسندرا،

غازی آباد۔۲۰۱۰۱۲۱ موبائل۔ 986827119

منفرد و مخصوص انداز و اسلوب کا رائٹر اور اسکالر

(ڈاکٹر اشرف آثاری کی کتابیں اردو ادب اور تنقید نگاری میں قابلِ قدر اضافہ)

پروفیسر محمد اسلم (رجسٹرار سنٹرل یونیورسٹی) سری نگر

پیشے سے ایک ہومیو پیتھک ڈاکٹر ہونے کے باوجود ڈاکٹر اشرف آثاری نے اردو زبان و ادب اور اردو تنقید نگاری میں، اپنے تخلیقی ادب سے اردو ادبی دنیا میں نام کمایا ہے۔ انہوں نے حال ہی میں اپنی تین عدد کتابیں شائع کیں۔ ''عصری ادب کے رنگ و آہنگ (ا)''، ''علامہ اقبال اور مرزائیت'' اور ''افسانہ لکھ رہا ہوں'' (افسانوی مجموعہ) ان کتابوں کے مطالعے سے موصوف کی خداداد قابلیت اور موجودہ مسائل کے متعلق ان کے عمیق اور بھرپور مطالعے، مشاہدے اور بصیرت و بصارت کا پتہ چلتا ہے۔ پہلی دو کتابیں ڈاکٹر اشرف آثاری کے ان فکر انگیز مضامین کے مجموعے ہیں جو ڈاکٹر اشرف آثاری نے وقتاً فوقتاً تحریر کئے ہیں اور ملک کے مختلف معیاری اردو رسائل و جرائد میں شائع کروائے ہیں۔ 'عصری ادب کے رنگ و آہنگ' میں لگ بھگ ۳۶ تحقیقی اور تنقیدی مضامین ہیں جو موصوف نے مختلف شعراء اور ادباء اور دیگر موضوعات پر تحریر کئے ہیں مثلاً مرزا غالب، علامہ اقبال، عشرت کرتپوری، استاد رسا دہلوی، شہہ زور کشمیری، پشکر ناتھ، نور شاہ، حکیم منظور وغیرہ اور دیگر موضوعات پر۔ موصوف نے زیر تذکرہ قلمکاروں کے مقام و مرتبے اور ان کے اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج میں قابلِ قدر حصے پر کھل کر بات کی ہے۔ صفحہ ۲۴ پر ''عقیدتِ اقبال کی آڑ میں مسخ اقبال کی مہم'' مضمون میں انہوں نے ان لوگوں کی خوب خبر لی ہے جو علامہ اقبال کے فکر و فلسفے کو غلط اور گمراہ کن انداز میں پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے علامہ اقبال کے فکر و فلسفے پر کام کرنے والے اسطرح کے مفکرین اقبال کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ اقبال کے فکر و فلسفے پر بات

کرنے کے بجائے اپنی ترجیحات اور پسند وناپسند کو ان کے ساتھ منسوب کرتے ہیں اور اپنے خول سے کبھی باہر نہیں آتے اور اسطرح سے اپنے اس منفی رویہ اور سوچ سے وہ علامہ اقبال کی امیج کو خراب کرتے ہیں۔ڈاکٹر اشرف آثاری نے ایسے نام نہاد مفکرین اقبال کی سخت مخالفت کی ہے جو اپنے الفاظ ونظریات پر علامہ کی مہر ثبت کرنے کے درپے ہیں۔

''علامہ اقبال اور مرزائیت'' ڈاکٹر اشرف آثاری کی ایک اہم اور فکر انگیز تصنیف ہے جس میں انہوں نے علامہ سے متعلق ان تمام حقائق کا مدلل اور مفصل جائزہ پیش کیا ہے جو اس ضمن میں علامہ کے چہیتے بھتیجے جسٹس اعجاز احمد اور اردو زبان کے ایک نامور محقق اور نقاد تارا چرن رستوگی نے ماہنامہ شاعر کے خصوصی اقبال نمبر میں چھپے اپنے مضامین میں کیا تھا۔

''افسانہ لکھ رہا ہوں'' ڈاکٹر اشرف آثاری کے ۳۵ افسانوں کا مجموعہ ہے جو اکثر روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے حالات واقعات پر مبنی ہیں۔یہ افسانے دونوں طرح کے روایتی اور علامتی انداز میں تخلیق کئے گئے ہیں اور بقولِ مصنف کے ہی زندگی کی برہنہ سچائیوں کا عکس و آئینہ ہیں۔صفحہ نمبر ۱۰ پر خود لکھتے ہیں کہ ایک دو افسانے پڑھ کر قاری کو یہ بھی محسوس ہوسکتا ہے کہ وہ افسانہ پڑھ رہا ہے یا انشائیہ' ایسا دراصل کسی خیال کو کسی اضافے کے بغیر ہی، اپنی اصل حالت میں پیش کرنے کی وجہ سے ہوسکتا ہے۔کہ کسی خیال کو افسانوی رنگ دینے سے اس کا حقیقت پسندانہ بیانیہ متاثر ہونے کے پیشِ نظر ایسا ممکن ہوسکتا ہے۔اس مجموعے میں ''پھانس'' ''ملامت سے ملامت تک'' اور بندر بڑے یا ریچھ'' کے عنوانات پر افسانے بھی ہیں جو مصنف کے ذاتی تجربات پر منحصر افسانے محسوس ہوتے ہیں۔ان افسانوں کا امتیاز یہ بھی ہے کہ ہر افسانے کا اسلوب و اسٹائل الگ الگ اور منفرد ہے جنہیں پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ اشرف

آثاری قارئین کو ان مسائل سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔ جن سے وہ دو چار ہیں اور جو صرف ان کے اپنے مسائل نہیں ہیں بلکہ ہم سب کے مسائل ہیں۔ ڈاکٹر اشرف آثاری نے اچھی تصویر کشی کی ہے۔ خالی خولی لکیروں میں اسطرح رنگ بھرنے میں ماہر ہیں کہ وہ آپ کے سامنے بولتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ''ملامت سے ملامت تک'' عنوان کے تحت افسانے میں انہوں نے ایک ماہرِ نفسیات کی طرح ہی اپنے اندر پیدا ہونے والے افکار و احساسات کا انتہائی باریکی کے ساتھ محاسبہ کیا ہے اس نے ایک نبض شناس معالج کی طرح ایک ایک دھڑکن کا حال معلوم کیا ہے اس علامتی افسانے کی ابتدا اس اقتباس سے ہوتی ہے۔

''میں نے اس کی غیرت کو للکارا، اس کی افلاس کو فحش گالی دی، اس کی نا آسودگی کے منہ پر زور دار طمانچہ مارا، اس کی غربت سے پردہ اٹھایا، اسے برا بھلا کہا، کوسا، ڈانٹا یہاں تک کہ اسے زور زور سے مارا بھی۔

لیکن وہ خاموش رہا، بالکل خاموش!! جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو، اس نے مجھے روکا اور نہ ہی ٹوکا اور نہ کچھ کہا اور نہ اس نے میری اس نازیبا اور ناشائستہ حرکت پر اپنا زرا سا بھی ردِ عمل ظاہر کیا؟ اور نہ ہی میری کسی بات کا کوئی جواب ہی دیا۔''

اقتباس۔ ''ملامت سے ملامت تک''

مجموعے کے صفحہ ۲۹ پر ''یادوں کے دفتر'' عنوان سے چھپے افسانے میں مصنف نے کشمیر میں موجودہ نامساعد اور ابتر حالات کا ایک پہلو بہت خوبصورتی کے ساتھ اجاگر کیا ہے۔ ایک ایسے سنجیدہ اور رنجیدہ واقعے کو انہوں نے قلمبند کیا ہے جو پورے وجود کو ہلا دیتا ہے اور بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس افسانے کی مرکزی کردار تسلیمہ کی درد بھری زندگی سے پردہ اٹھایا گیا ہے اور اس کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات کی عکاسی کی گئی ہے کہ اسے کن کن مراحل سے گذرنا پڑا۔ اس کہانی کی واحد مونث متکلم جو

تسلیمہ کی بچپن کی سہیلی ہے
وقت کے ساتھ ساتھ دو سہیلیوں کے تعلقات میں آنے والے اتار چڑھاؤ کی روداد ہے
جس کا اختتام خوبصورت انداز میں ہوتا ہے۔
اور ایک افسانہ ''افسانہ لکھ رہا ہوں'' ہے جس کے عنوان پر ڈاکٹر اشرف آثاری نے اپنے
پہلے افسانوی مجموعے کا نام رکھا ہے۔ اس افسانے میں ہم سب کی کہانی ہے ہم سب
انسانوں کی جنھیں اشرف المخلوقات کہا گیا ہے ان کی نفسیات۔ ذہنی انتشار اور تذبذب
جس کی کوئی انتہا ہی نہیں ہے۔
سبیلہ ایک ایسی خاتون کی کہانی ہے جو اپنی پہلی بچی کا نام سبیلہ رکھ کر فوت ہو
جاتی ہے۔ یہ نوجوان خاتون انتقال سے قبل اپنے بچے کا نام، لڑکی ہونے کی صورت میں
سبیلہ خود تجویز کرتی ہے اور اسے اپنے زندہ بچ جانے کی کوئی امید نہیں ہوتی یہ مرحلہ خاتون
کی والدین کے لئے انتہائی تکلیف دہ بن جاتا ہے خاص طور پر خاتون کے انتقال کے
بعد اس کی یاد ان کے قلب و روح میں ایک تیز کانٹے کی طرح چبھتی رہتی ہے اور بوڑھے
والدین کی حالت نا قابلِ برداشت بن جاتی ہے۔ اس کہانی کا اختتام بھی بہت عمدہ انداز
میں کیا گیا ہے کہ روتی ہوئی سبیلہ پر یہ گمان کیا جاتا ہے کہ کہیں وہ اپنی فوت شدہ والدہ کو
تلاش تو نہیں کر رہی ہے؟ صفحہ ۱۳۳ پر اور ایک مختصر ترین افسانہ ہے اس منی افسانے کا
عنوان سوال ہے ایک بکھارن کا کم عمر اور معصوم بچہ اپنی ماں سے یہ سوال کر بیٹھتا ہے کہ
اس کا باپ کون ہے؟ وہ اس سے کب مل سکتا ہے؟ نوجوان بکھارن اپنے بچے کو اس
جواب سے بہلاتی ہے کہ نوجوان بکھارنوں کے بچوں کے باپ نہیں ہوتے اور وہ ان سے
کبھی نہیں مل سکتے ہیں؟۔

الغرض ڈاکٹر اشرف آثاری کی یہ تینوں کتابیں خاص طور پر زیر
تبصرہ افسانوی مجموعہ بہت عمدہ کتابیں ہیں اور اچھی چھپی ہیں۔ اردو ادبی حلقوں میں انہیں

بہت انہماک اور دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا واقعی ڈاکٹر اشرف آثاری نے دم توڑتی ہوئی اردو زبان کے لئے قابلِ تحسین کام کیا ہے جس کی ستائش ہونی چاہئے۔ خاص کر تخلیقی اور تنقیدی ادب کے شعبے میں، کتابیں مجلد ہیں اور ان کی پرنٹنگ بھی عمدہ ہے۔(۶ ستمبر ۲۰۱۴ء کے GREATER KASHMIR میں چھپے مضمون کے اقتباس کا اردو ترجمہ)

پروفیسر محمد اسلم
۶ ستمبر ۲۰۱۴ء

تاثرات عبدالغنی شیخ لداخی

دنیا کے چند معروف قلمکار پیشے سے ڈاکٹر تھے۔ان میں دو اہم نام جو مجھے اس وقت یاد آرہے ہیں وہ سومروٹ مام اور چیخوف ہیں ان سے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کی نگارشات میں ان کی طبی زندگی کے مشاہدات اور تجربات نظر آتے ہیں۔ دونوں نے ڈاکٹری پیشے کو خیر باد کہا تھا اور اپنی زندگی تخلیقی کام میں وقف کی۔ مغرب میں ایک ادیب اپنے قلم کے بل بوتے، غمِ روزگار سے بالاتر، آرام سے زندگی گزار سکتا ہے۔ پیشہ وارانہ مصروفیات کے باوجود ڈاکٹر اشرف آثاری لکھنے کے لئے وقت نکالتے ہیں۔ ان کی تحریروں کی گونا گونی دیکھ کر شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ زود نویس بھی ہیں اور بسیار نویس بھی۔

پیشِ لفظ

درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

اشرف آثاری

اب یہ میرا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ پہلا افسانوی مجموعہ "افسانہ لکھ رہا ہوں" کی اشاعت کے متعلق کئی غلط فہمیاں رہ گئی تھیں جن کا ازالہ کرنا بہت ضروری سمجھتا ہوں۔ دراصل اس کی اشاعت بہت عجلت میں ہوگئی اور اس پہ ستم بالا ستم یہ کہ مسودے کی جو کاپی مکمل پروف ریڈنگ کے بعد پرنٹر کو دینی تھی وہ اس تک نہیں پہنچی اس نے غیر تصحیح شدہ مسودے کو ہی اصل سمجھکر چھاپ دیا اور کتاب موجودہ صورت میں سامنے آگئی کہ اس میں لاتعداد املاء، گرامر اور زبان و بیان کی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ جن کا ازالہ اغلاط نامہ کتاب کے ساتھ چپکا کر کرنے کی کوشش سے کی گئی اس کے باوجود بھی کتاب کے ساتھ پورا انصاف نہ ہوسکا کہ لاتعداد لوگوں کو غلط فہمیاں پیدا ہوگئیں یہی ایک وجہ تھی کہ کتاب زیادہ لوگوں تک نہ پہنچی اب جب دوسرا ایڈشن چھپنے جائے گا تو یہ خامی دور کی جائے گی۔

"بلھا کیہ جاناں میں کون؟" میرا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ "بلھا کیہ جانا میں کون؟" شاید یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ سلسلۂ قادریہ کے پنجابی زبان کے مشہور و معروف صوفی شاعر حضرتِ بلھے شاہ کا شعر ہے۔ اور اس عنوان پر اس افسانوی مجموعے میں ایک افسانہ بھی شامل ہے جو ذاتی طور پر مجھے بھی پسند ہے۔ اور یہ مشترکہ ہندوستان کی ایک برہنہ حقیقت بھی ہے جو مجھے ایک مولوی صاحب نے سنائی تھی اور اسے میں نے کہانی کا روپ دے دیا۔ میری کوشش کو اسقدر پسند کیا جائے گا مجھے اندازہ نہیں تھا۔

افسانہ "بلھا کیہ جانا میں کون؟" سب سے پہلے دہلی اردو اکاڈمی کے "ایوان

اردو" میں چھپا۔ کچھ وقفہ کے بعد پنجاب کے مشہور اور کثیر الاشاعت روزنامہ ہندسماچار نے خود ہی اسے ایوان اردو سے نقل کر کے اپنے ادب ایڈیشن میں فرنٹ پیج پر چھپایا تھا کہانی کیا چھپنی تھی کہ مجھے لاتعداد لوگوں کے فون اور ایس ایم ایس آنے شروع ہو گئے۔ جن میں اس افسانے کے مرکزی خیال کو کافی سراہا گیا اور تعریف وتوصیف کی گئی فون کرنے والوں میں ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ موجود تھے۔ آج بھی کچھ یادگار ایس ایم ایس میرے فون کی میموری میں موجود ہیں۔ بہر حال یہ میرے لئے ایک بہت بڑا اعزاز تھا اور اس اقدام سے میری زبردست حوصلہ افزائی ہوئی۔ اور اس بات کا بخوبی اندازہ بھی کہ اگر تخلیق اچھی، صاف ستھری اور جاندار ہو تو حوصلہ افزائی بھی ضرور مل جاتی ہے ورنہ بہت کم لوگ بغیر کسی ذاتی مطلب و مقصد کے کسی کا حوصلہ بڑھاتے ہیں۔ بقولِ مرزا غالب کے۔

حوصلہ کس کا بڑھاتا ہے کوئی ؎ چاہیئے خود پہ یقینِ کامل

دوسری بات یہ کہ میرے پہلے افسانوی مجموعے اور اب اس دوسرے مجموعے میں شامل اکثر افسانے بذاتِ خود میرے یا میرے کسی دوست کے ساتھ پیش آنے والے واقعات و حادثات کا عکس و آئینہ یا آپبیتی ہیں۔ جس کو میں نے حتی الامکان اپنی اصل حالت میں ہی پیش کرنے کی کوشش کی ہے خال خال ہی کہیں کہیں پر پلاٹ کی مناسبت سے یا پھر اصل حقیقت کو افسانوی موڑ دینے کے لئے ذرا سی تبدیلی یا پھر پھیر بدل کیا ہے۔

میرا ماننا ہے کہ ہر حقیقت اپنے اصل روپ میں ہی زیادہ خوبصورت، جاذبِ نظر اور متاثر کن ہوتی ہے۔ اس کا چہرہ بگاڑنا اس کو مسخ کرنے کے مترادف ہے۔ ہاں موجودہ نامساعد حالات کے پیشِ نظر کبھی کبھی مصلحت اندیشی سے بھی کام لینا پڑتا ہے اسی حد تک جس حد تک وہ بہت ضروری ہو کہ اس کے بغیر کوئی چارہ نہ ہو۔

تنقیدی مضامین اور تبصروں وغیرہ پر مبنی میری کتاب ''عصری ادب کے

رنگ و آہنگ (۱)'' کی دوسری جلد بھی اس وقت زیرِ ترتیب ہے اور اگر اللہ نے چاہا تو ''بلھا کیہ جاناں میں کون؟'' کے بعد وہی منظر عام پر آجائے گی۔ اس میں کئی نامور شعراء و ادباء پر مضامین کے علاوہ علامہ اقبال پر کئی طویل مضامین شامل ہیں جو اس دوران مختلف معیاری رسائل و جرائد میں چھپے ہیں۔ علامہ کے فکر و فلسفے کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے والوں کے جواب میں لکھے گئے ہیں۔

میں ذاتی طور پر شکر گزار ہوں عاقبؔ مقبول ملہ بارہ مولہ کا کہ جس نے مجھے اور میری مقدور بھر افسانہ نگاری کا، اپنی ایم فل کی ڈگری بعنوان ''ڈاکٹر اشرفؔ آثاری حیات اور شخصیت'' کے لئے ۲۰۱۴ء میں انتخاب کرلیا اور پھر ان کے اساتذہ پروفیسر مظفر علی شہ میری صدرِ شعبہ اردو، اردو یونیورسٹی آف حیدر آباد پروفیسر انوار الدین، پروفیسر رضوانہ معین صاحبہ، ڈاکٹر حبیب نثار صاحب، ڈاکٹر محمد زاہد الحق صاحب، ڈاکٹر نشاط صاحب، ڈاکٹر محمد کاشف صاحب خاص طور پر ان کے نگراں ڈاکٹر اے آر منظر صاحب کا جن کی رہنمائی اور بے لوث خلوص و شفقت کی وجہ سے یہ سب ممکن بن گیا۔ دیگر دوستوں کا بھی جن کا تذکرہ عاقب مقبول نے اپنے مقالے میں کیا ہے۔ جیسے فیض احمد فیاض وغیرہ دوستوں کا، جنہوں نے اسے منظوری بھی دے دی اور بعد میں اسے سنٹرل یونیورسٹی حیدر آباد سے تسلیم بھی کروایا جو واقعی مجھ جیسے ایک عام اردو ادیب کے لئے ایک بہت بڑی عزت افزائی اور سمان ہے۔

آخر میں، میں پروفیسر حامدی کاشمیری، جناب نور شاہ، جناب عبدالغنی شیخ لداخی، حسن ساہوؔ، جناب عبداللہ خاور، جناب وحشیؔ سعید، جناب دیپک بدکی، پروفیسر محمد اسلم، جناب اسداللہ وانی کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اپنے زریں خیالات اور گرانقدر رائے سے نوازا اور ناچیز کی حوصلہ افزائی فرمائی۔

اس کتاب کی تکمیل کے دوران میرے ایک دیرینہ دوست
ایڈوکیٹ پیرزادہ شمش الدین صاحب مرحوم ہو گئے ان کے ساتھ میرے کافی دیرینہ مراسم تھے کتاب اشاعت کے لئے جانے سے ذرا قبل مجھے یہ خیال آیا کہ کیوں نہ میں اس کتاب کو مرحوم کی نذر کر کے ان کے تئیں اپنا خراج عقیدت پیش کروں سو میں یہ کتاب مرحوم کی نذر کرر ہا ہوں، میں عرض کر چکا ہوں کہ مرحوم کے ساتھ اکثر دینی معاملات پر میری بات چیت ہوا کرتی تھی اور جب جب رسولِ آخر الزمان ﷺ یا پھر آخرت کی بات ہوتی تھی تو مرحوم نم دیدہ ہو جاتے تھے۔ شاید اللہ تعالیٰ نے انہی اوصاف کی وجہ سے انہیں مغفرت فرمائی ہو۔ امید کرتا ہوں کہ ہم بھی انشااللہ بخشے جائینگے آمین ثمہ آمین۔

اس افسانوی مجموعے میں شامل اکثر افسانے ملک کے مقتدر اردو رسائل و جرائد، جیسے آجکل، ایوانِ اردو، شاعر، انتساب، تحریرِ نو، کتاب نما اور نگینہ انٹرنیشنل وغیرہ میں چھپے ہیں اور وقتاً فوقتاً اردو افسانے کے بلند ذوق قارئین نے مجھے اپنے قیمتی تاثرات اور گرانقدر آرا سے بھی نوازا، آپ سے بھی التماس ہے کہ آپ بھی اپنے خیالات سے ضرور نوازئے گا جو واقعی میرے لئے مشعلِ راہ ہونگے۔

میں وحشی سعید صاحب کا خاص طور پر شکر گزار ہوں جو ہمیشہ اراکینِ نگینہ کی تصانیف کی نگینہ انٹرنیشنل کے ساتھ ساتھ ہی رسم رونمائی میں پیش پیش رہتے ہیں۔ یہ واقعی ان کی دریا دلی اور بے لوث خلوص اور محبت کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائیں۔

والسلام
خیر اندیش
اشرف آثاری سری نگر



بلھا کیہ جاناں میں کون؟

زندگی کس طرح سرعت سے گزر گئی؟ پتہ ہی نہیں چلا؟ دریا کی روانی، پھر بھی سبک رفتار ہوتی ہے۔لیکن موسمی بارشوں سے بھر جانے والے برساتی نالے کی رفتار کیا؟ گھن گھرج بس آنی جانی ہوتی ہے، نہ اتار و چڑھاؤ کا پتہ چلتا ہے اور نہ ہی طغیانی و خشک ہونے کا۔طوفان کی طرح آتا ہے اور طوفان کی طرح ہی سب کچھ اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا ہے اور صرف کھٹی میٹھی یادیں چھوڑ کر گذر جاتا ہے۔

زندگی کے گذرتے ہوئے پل، دریا نہیں؟ برساتی نالے کی طرح ہی ہو گئے۔کب آنکھ کھولی؟ کب جوان ہو گئے؟ اور کب پیری مسلط ہو گئی؟ سب کچھ جیسے ایک خواب کی طرح ہی گذر گیا۔حافظہ اچھا ہو تو یاد بھی رہا، نہیں تو ایک دھندلا دھندلا سا عکس، شعور و سوچ کے نہاں خانے میں کہیں پر محفوظ ہو گیا۔جسے پیری میں کبھی کھنگالنے کی فرصت مل ہی جاتی ہے خاص طور پر تب، جب کوئی پرانا واقعہ یاد آجائے یا پھر کسی بچپن

کے دوست سے مدتوں بعد مل بیٹھ کر بات کرنے کا موقعہ نصیب ہو۔

یہ واقعہ بھی بہت پرانا ہے۔نوجوانی کا واقعہ‘ جب میں بمبئی‘ آج کی ممبئی کے بھنڈی بازار سے ملحق‘ ایک اردو رسالے کے مدیر سے استاذی کے ساتھ ملنے گیا تھا۔

پاس ہی ہم جان پہچان والے ایک مولانا سے بھی ملنے گئے تھے۔ باتوں باتوں میں قریب کی مسجد سے اذان ہوتے ہی مولانا اپنا جوتا تلاش کرتے ہوئے بولنے لگے تھے۔ ”میاں ایسا ہے کہ ہمیں ان نمازوں‘ روزوں اور دیگر نیک اعمال کا اجر آپ سے زیادہ ملے گا؟ وہ اسلئے کہ ہم جہاں رہتے ہیں وہاں عام انسان کو
گمراہ کرنے کے سبھی اسباب وسامان میسر وموجود ہیں بلکہ بہت آسانی سے میسر وموجود ہیں۔جس گناہ کو انجام دینے کی نیت وخواہش ہو؟ کر سکتے ہو۔بس جیب میں پیسے ہونے چاہئے۔ جبکہ آپ کے ہاں ایسا نہیں ہے۔آپ لوگ ابھی بہت پسماندہ ہو کہ دور دور تک کسی قحبہ خانے‘ قمار خانے یا شراب خانے کا نام ونشان تک نہیں؟ جہاں نظر دوڑاؤ بس خوبصورتی‘ صفائی ستھرائی‘ سچائی اور سادگی نظر آتی ہے۔ نہ ماحول کی اور نہ کردار واعمال کی ہی کثافت وغلاظت کہیں پر نظر آتی ہے اور نہ ہی گمراہی اور عاقبت وکردار کے بگڑنے کا ڈر یا احتمال ہی ہے؟۔

لگ بھگ تیس سال گذر گئے ہوں گے‘اس واقعے کو پیش آئے ہوئے لیکن ایسا لگ رہا ہے جیسے کل ہی کی بات ہو۔اب وہ بات کہاں! گناہ اور جرائم کی آلودگی نے ہر طرف اپنا جال بچھا دیا ہے اور کوئی کونہ بھی اس سے اب محفوظ نہیں ہے۔حضرتِ انسان ‘اسطرح ان میں گھر چکا ہے کہ راتوں کی نیند اور دل کا قرار کھو چکا ہے۔اب اگر کہیں سے اسے روحانی تسکین ملتی ہے تو وہ صرف اللہ والوں کے ہاں سے ملتی ہے۔ جہاں وہ سب کچھ بھول کر کسی اور دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔جو دنیا‘ حرص وہوس کی دنیا نہیں اور نہ غرور وتکبر کی دنیا ہے۔عجز وانکساری اور افوہ ودرگذر کی دنیا اور سکون واطمنان کی دنیا ہے۔

پنجاب میں ایک بہت بڑے صوفی اور ولی اللہ کے مرقد پر حاضری کے بارے میں، ایک عرصہ سے سوچ رہا تھا کہ آج اتفاقاً موقع مل ہی گیا۔ موقعہ کیا ملا، بس انہوں نے بلا لیا، سو حاضر ہو گیا۔

حاضری دینے پہنچا تو پاس ہی بیٹھے ہوئے ایک فقیر و مجذوب کی دل اور روح کی گہرائیوں میں اترنے والی پر اثر اور مسحور کن آواز "بلھا کیہ جاناں میں کون؟ "بلھا کیہ جاناں میں کون؟" نے جیسے اندر کہیں پہ زوردار ارتعاش پیدا کیا اور اپنی طرف، اس طرح متوجہ کیا اور کھینچ لیا جس طرح ایک مقناطیس لوہے کو کھینچ لیتا ہے اس آواز کو بار بار سننے کی خواہش پیدا ہو رہی تھی۔ بھلے شاہ کا عارفانہ کلام مجھے ہمیشہ اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا ہے اور اسے سن کر بھلے شاہ اور راہِ سلوک میں، انہیں درپیش مسائل کا سارا منظر نامہ میری نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے اور میرا دل و دماغ اسی کیفیت میں مستغرق ہو جاتا ہے اور میں آنکھیں بند کر کے، کونیا میں مولانا رومؒ کے مرقد پر، اللہ کے ساتھ لو لگانے والے درویشوں کے ساتھ مسلسل و متواتر ناچنے اور جھومنے لگتا ہوں بالکل اسی طرح جس طرح حضرتِ بھلے شاہؒ ناچتے اور جھومتے تھے۔

بہر حال کسی طرح، سکون و اطمنانِ قلب کی دولت سمیٹنے کے بعد میں باہر آ گیا اور سڑک پر چہل قدمی کرنے لگا۔ پاس ہی سکھوں کا ایک بہت بڑا گوردوارہ بھی دکھائی دینے لگا۔ گوردوارے کے سامنے ہی ایک اچھی خاصی کوٹھی تھی، جس کا پھاٹک کھلا تھا۔ سامنے ہی کچھ سردار کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور چارپائی پر ایک 'بڑی بی' بھی بیٹھی ہوئی تھی، جونہی میں اس پھاٹک کے سامنے سے چلتے ہوئے آگے کی طرف بڑھنے لگا تو اس بزرگ خاتون کی آواز "مولوی صاحب السلام علیکم" نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر دیا۔ 'وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ' کہنے کے بعد، کچھ وقفے تک میں حیران و ششدر رہ گیا ۔ کہ آخر یہ کیا معاملہ ہے؟ کیا پتہ کون ہے؟ کیا ہے؟ فوری طور پر کچھ کہنا مشکل بلکہ

ناممکن سا تھا؟۔ ولی اللہ کے مرقد پر بیٹھے مجذوب کی آواز ''بلھا کیہ جاناں میں کون؟'' اب تک میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔

میں آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ پاس ہی کرسی پر بیٹھے ایک خوبصورت سکھ نوجوان نے مجھے، کرسی سے اٹھتے ہوئے اس پر ذرا دیر آرام کرنے اور دم لینے کے لئے کہا۔ بڑی بی نے بھی انتہائی مہمان نوازی کے لہجے میں، اس انداز سے، اس نوجوان کی بات کی تائید کی کہ میرے پاؤں جیسے رک سے گئے اور ایک ادھیڑ عمر کے دار جی کرسی سے اٹھ کر، یہ کہتے ہوئے میری طرف بڑھے کہ ''مولوی صاحب گرمی بہت ہے پانی شانی پی لیجئے۔''

ان سب کے لہجے کی اسقدر اپنائیت نے بالآخر میرے پاؤں میں زنجیر ڈالدی اور مجھے کرسی پر بٹھا دیا۔ بزرگ خاتون اندر چلی گئی اور کچھ وقفے کے بعد، لسی کا ایک گلاس ،بسم اللہ کہتے ہوئے میری جانب بڑھانے لگی۔ میں نے حیرانی کی حالت میں لسی کا گلاس ہاتھ میں لے تو لیا؟ لیکن۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟

گلاس خالی کرنے سے قبل ہی وہ پھر میری جانب مخاطب ہوئی۔ ''مولوی صاحب! آپ کافی تھکے ہوئے لگ رہے ہیں اور آپ کے ماتھے پر کافی پسینہ بھی دکھ رہا ہے۔ عصر کی اذان بھی ہو رہی ہے، آپ نماز پڑھ کر اور کچھ کھا پی کر چلے جائیے گا۔ میرے جواب کا انتظار کئے بغیر ہی اس نے پاس ہی بیٹھے ہوئے سکھ نوجوان سے مجھے واش روم تک لے جانے کے لئے کہہ دیا۔ جو وضوء کے بعد مجھے ایک کمرے میں لے گیا۔

کمرہ کیا تھا؟ ایک جانب مصلّا بچھا ہوا تھا دوسری جانب رحل پر قرآنِ شریف اور تسبیح رکھی ہوئی تھی آگے کمرے کی دیوار پر کعبہ شریف کی تصویر آویزاں تھی۔

عصر کی نماز تو میں نے پڑھ لی لیکن میرے اعصاب پر ایک عجیب کیفیت طاری رہی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر یہ کیا معاملہ ہے؟ یہ بزرگ خاتون کون ہے؟ اس کا یہ مسلمانوں جیسا وطیرہ۔۔۔؟ نوکرانی تو نہیں ہو سکتی۔۔۔؟ اور نہ کوئی پڑوسن ہی؟ ہوتی، تو اس کا گھر

بھی یہیں کہیں پاس پڑوس میں ہی ہوتا اور مجھے یہاں نہیں وہاں لے جاتی۔۔۔؟اس طرح کے نہ جانے کتنے سوالات میرے ذہن میں ابھر رہے تھے اور ان سب سوالات کے بیچ' مجذوب کی آواز اب تک میرے تحتِ شعور میں کہیں پر "بلھا کیہ جاناں میں کون؟'بلھا کیہ جاناں میں کون؟"۔۔!! گونج رہی تھی' یا پھر میرا تعاقب کر رہی تھی؟

میرے چہرے کی متحیر حالت دیکھ کر بڑی بی' پھر مجھ سے مخاطب ہوگئی! شاید اس لئے بھی کہ وہ اس سسپنس کو زیادہ دیر برقرار رکھنا نہیں چاہتی تھی۔

"مولوی صاحب آپ حیران ہو رہے ہونگے' میں ایک عزت دار مسلمان گھرانے سے ہوں۔ تقسیمِ وطن کے وقت' میں اپنے خاندان سے بچھڑ گئی' اپنے بابل کا گھر سدا کے لئے چھوٹ گیا' ماں باپ' بھائیوں' بہنوں' سہیلیوں اور سکھیوں سے بچھڑنے کا احساس مجھے عمر بھر رلاتا رہا۔۔۔۔۔لیکن'۔۔۔۔ایک تسلی سی بھی ہے' اپنے پرکھوں سے جاملنے کی۔۔۔۔۔۔۔!"

اس بزرگ خاتون کی آواز رندھی ہوئی تھی' ایسے لگ رہا تھا کہ وہ بہت مشکل سے اپنے گلے میں اٹکتے ہوئے الفاظ ایک ایک کر کے باہر نکال رہی ہے۔ کچھ وقفے تک فضا پر سکوت سی طاری رہنے کے بعد وہ پھر بولنے لگی؟

"میری شادی ایک سکھ گھرانے میں ہوگئی۔ میرے تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ یہ سریندر میرا چھوٹا بیٹا ہے۔ انجینئرنگ کے آخری سال میں ہے۔ بڑے والے دونوں بیٹے ڈاکٹر ہیں۔ دار جی چند برس قبل ہی ہم سے جدا ہوگئے۔ میری دونوں بیٹیاں بھی اپنے اپنے گھروں میں' اپنے گھر پریوار میں خوش وخرم ہیں۔ اپنے اس گھر میں' میں بھی پوتے پوتیوں' نواسے نواسیوں' بیٹے بیٹیوں' بہوؤں اور دوسرے سب لوگوں' کے ساتھ زندگی گزار رہی ہوں' اور اچھی طرح سے گزر بسر ہوگئی اور ہو رہی ہے۔۔۔۔۔آگے بھی ۔۔۔۔۔اللہ ہی مالک ہے!۔"

کچھ وقفے تک پھر سکوت سی چھائی رہی اور خاموشی طاری رہی۔

پھر وہی قدرے رندھی رندھی سی آواز آنے لگی۔ ''مولوی صاحب، جس کمرے میں آپ بیٹھے ہیں یہ میرا ذاتی کمرہ ہے۔ والدین کا دیا ہوا نام زینب ہے، جو آج تک بدستور ہے۔ الحمد اللہ نمازِ پنجگانہ بھی ادا کرتی ہوں اور رمضان شریف کے روزے بھی رکھتی ہوں۔ قرآن شریف کی تلاوت بھی میرا معمول ہے سب کچھ قبول کرنے والے پر چھوڑ رکھا ہے وہ اسے قبول فرمائے یا پھر۔۔۔۔ میرے۔۔۔ منہ پر ۔۔۔۔دے مارے۔۔۔۔۔اس کی مرضی۔۔۔۔۔؟''

پھر ہلکی ہلکی رونے کی ہچکیوں کے ساتھ خاموشی سی طاری ہوگئی اور کچھ وقفے کے بعد مکالمہ بحال ہوگیا۔

ہمارے آباؤ اجداد کا مقبرہ صوفی جی کے مرقد کے ساتھ ہی ہے۔ میں نے وصیت کر رکھی ہے کہ مجھے بھی وہیں، میرے دادا دادی کے پہلو میں سلا دینا۔ سارا خاندان سرحد کے اس پار چلا گیا ہے اور سب اب دوسرے ملک کے باشندے ہو گئے ہیں اور بیچ میں ایک خونی لکیر بھی ہے یہاں اب بس میں ہی ہوں جو اس مزار کی آخری وارث ہے۔ پاس پڑوس میں۔۔۔اور۔۔۔کوئی۔۔۔۔نہیں ہے۔''

اس کے بعد وہ اپنی رندھی ہوئی آواز میں اور کچھ کہنے کی مسلسل جستجو کے باوجود بھی کچھ کہہ نہ سکیں اور ان کا چھوٹا بیٹا سریندر، اپنی ماں زینب کی ایک ایک بات بالکل خاموشی کے ساتھ اپنی نم دیدہ آنکھوں سے غور سے سن رہا تھا اور بیچ بیچ میں ناک پونچھنے کے بہانے، اپنی آنکھیں بھی پونچھ لیتا تھا۔

سریندر ہی کیوں؟ میں بھی تو بیچ بیچ میں، سر پر پڑے اپنے رومال سے اپنی آنکھوں کو پونچھ لیتا تھا۔ جو صوفی جی کے مرقد پر، پہلے ہی سے بہائے گئے، لاتعداد آنسوؤں کو جذب کر چکا تھا اور شدید گرمی سے کب کا سوکھ بھی چکا تھا۔ سریندر کی بات تو سمجھ

میں آتی ہے لیکن میں۔۔۔۔؟ میرا بظاہر ان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا یا کوئی رشتہ نہیں تھا؟ لیکن پھر بھی۔۔۔؟ شاید کوئی۔۔۔۔رشتہ۔۔۔۔ہو بھی۔۔۔؟ میرے اندر کے تمام وسوسے اور واہمے دور ہو چکے تھے۔

چائے ناشتے کے بعد اب میں سڑک پر آ گیا تھا اور اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا، یہاں سے صوفی جی کا مرقد زیادہ دور نہیں تھا۔ میرے کانوں میں صوفی جی کے مرقد پہ بیٹھے ہوئے، اس فقیر ومجذوب کی آواز، ''بلھا کیہ جاناں میں کون؟'' پھر گونجنے لگی اور اب کچھ زیادہ ہی گونجنے لگی؟۔۔۔۔نہ جانے کیوں؟





کتے دہشت گرد نہیں ہوتے!؟۔

ایڈمنسٹریشن میں خانؔ صاحب کی اچھی ساکھ ہے اور لوگوں کی نگاہوں میں ان کی اچھی عزت وتوقیر ہے۔ ان کا تعلق لداخ سے ہے۔ ایک اچھے علمی اور شریف گھرانے سے ان کا تعلق ہے۔ اردو زبان کے علاوہ کئی دیگر مقامی زبانوں میں اچھے شعر کہتے ہیں اور کئی تحقیقی اور معلوماتی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ مقامی ریڈیو اور دوردرشن سے ان کا کلام معروف گلوکاروں سے گوا کر، انہیں خوب شہرت ودوام مل گئی ہے۔ بڑے حساس، صاف باطن، ایمان دار اور نیک وخداترس انسان ہیں انتظامیہ کے بڑے بڑے عہدوں پر رہ چکے ہیں اسلئے تقریباً سب لوگ انہیں جانتے ہیں۔

کریم نگر اس ریاست کا ایک دورافتادہ پہاڑی ضلع ہے یہاں زیادہ تر گوجر بکروال اور خانہ بدوش لوگ بودوباش اختیار کئے ہوئے ہیں۔ جن میں اکثر غریب اور مفلوک الحال کسان اور بھیڑ بکریاں پالنے والے لوگ شامل ہیں۔ جو اکثر مال مویشیوں کے ریوڑ ایک جگہ سے دوسری جگہ لاتے لیجاتے ہیں اور سرسبز چراگاہوں کے تعاقب

میں رہتے ہیں۔

خاں صاحب میرے دیرینہ دوست ہیں ان کے ساتھ اکثر فرصت کے اوقات میں ملنے ملانے کے مواقع ملتے ہی رہتے ہیں خاص طور پر ادبی نشتوں میں۔ کہ میں بھی اردو شاعری کا دیرینہ دلدادہ ہوں اور شعر موزون کرنے کے ہنر سے کچھ کچھ واقف بھی ہوں اور تک بندی بھی کرلیتا ہوں۔

کریم نگر آنا جانا لگا ہی رہتا ہے کہ یہاں میرے کئی قریبی دوست رہتے ہیں۔ اس بار ایک لمبے عرصہ کے بعد میں یہاں آیا تو پتہ چلا کہ خاں صاحب بھی حال ہی میں یہاں کریم نگر کے ڈی سی بن کر آئے ہیں اور انہوں نے اپنے عہدے کا چارج بھی سنبھالا ہے۔ میں نے من بنالیا کہ میں کل ان کے پاس ملاقات کے لئے جاؤں گا۔

خاں صاحب مجھے اپنے دفتر میں پاکر انتہائی خوش ہوگئے اور بڑے والہانہ انداز میں تپاک سے ملے۔ اب ہم اطمنان کے ساتھ چائے کی چسکیاں لے رہے تھے اور ادھر ادھر کی باتوں میں مشغول تھے کہ دروازے پر کوئی عورت چپراسی کے ساتھ الجھ رہی تھی۔ خاں صاحب نے بیل بجا کر چپراسی کو اندر بلایا کہ کیا ماجرا ہے وہ ہنستے ہوئے اندر آگیا اور ایک معمر عورت کے بارے میں بتانے لگا جو لاکھ سمجھانے کے باوجود بھی، ابھی اور اسی وقت ڈی سی صاحب سے ملنا چاہتی تھی۔

خاں صاحب نے چپراسی کو، اس عورت کو اندر بلانے کے لئے کہہ دیا کہ کچھ دیر بعد ایک عمر رسیدہ عورت' پھٹے پرانے اور میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس اندر داخل ہوگئی۔ اس کے ظاہری حلیے اور بول چال سے صاف ظاہر ہورہا تھا کہ یہ عورت گجر بکروال خاتون ہے۔

اس معمر خاتون کی عمر لگ بھگ اسی سال کی تھی۔ پیٹ میں آنت نہ منہ میں دانت والا معاملہ تھا۔ چہرہ سیاہی مائل' گال اندر پچکے ہوئے' منہ میں دو چار دانت اور کمزور بینائی

والی اندر دھنسی ہوئی پرنم آنکھیں، ہاتھ میں ایک لاٹھی، پیروں میں پلاسٹک کا ایک پھٹا پرانا جوتا جو جگہ جگہ سے کٹ پھٹ گیا تھا۔

معمر عورت ڈی سی صاحب کے کمرے میں آتے ہی، زور زور سے رونے لگی اور اپنی زبان میں کچھ بولتی بھی جا رہی تھی اس کی باتیں، مکمل طور پر ہماری سمجھ سے باہر تھیں اسلئے ہم دونوں متحیر آنکھوں سے اسے تک رہے تھے۔

خاں صاحب نے اپنے چپراسی سے پوچھا" عبدل یہ مائی کیا کہہ رہی ہے؟"
عبدل ہنستے ہوئے کہنے لگا" سر اس کا کتا گم ہو گیا ہے، اس کی گمشدگی پر اتنا ہلکان ہوئی جا رہی ہی،" معمر خاتوں سامنے بیٹھ گئی اور کچھ ہڑبڑانے لگ گئی۔ اس کی بوڑھی بے نور آنکھوں سے مسلسل آنسوں بہہ رہے تھے۔

خاں صاحب اپنی کرسی سے اٹھے سامنے بیٹھی ہوئی معمر خاتون کے پاس آکر اسے اٹھایا اور ساتھ ہی لگے ہوئے صوفہ پر بٹھا کر اسے دلاسہ دینے لگے اور پاس ہی کھڑے چپراسی عبدل کو چائے لانے کا حکم بھی دے دیا۔

وہ معمر خاتون اب اطمنان سے بیٹھی ہوئی تھی اور اس دوران چائے بھی آ گئی تھی۔ خاں صاحب بھی قریب ہی، اسی صوفے کے دوسرے کونے پر بیٹھ گئے اور اس معمر خاتون سے اپنی روداد دوبارہ دہرانے کے لئے کہہ دیا۔ عبدل کو بھی وہیں سمجھنے سمجھانے کے لئے رہنا پڑا۔

اس سارے معاملے کا لب لباب یہ تھا کہ یہ معمر بکروال خاتوں اپنا ریوڈ لے کر اپنے افرادِ خانہ کے ساتھ مغل روڈ کے سرحدی علاقے سے حال ہی میں گذر رہی تھی کہ اس کا کتا غائب ہو گیا۔ ڈھونڈھنے پر پتہ چلا کہ وہاں تعینات آرمی کے افراد اسے اپنے ساتھ لے گئے ہیں جو کتے کو واپس کرنے سے انکاری ہیں۔

خاں صاحب اور میں نے یہ سارا معاملہ غور سے سنا۔ خاں

صاحب نے عبدل کے ذریعے سے قلم اور کاغذ منگوایا اور اپنے ہاتھوں میں لے کر اس معمر خاتون سے حاصل شدہ ڈاٹا یوں تیار کیا۔

گمشدہ کتے کی ظاہری چال ڈھال، فربہ اور موٹا اور تازہ ہے۔ رنگ، گہرے سیاہ رنگ کا ہے۔ عمر، لگ بھگ چار سال کی ہے۔ زمان، سوموار ۱۹ر ستمبر ۲۰۱۱ء، وقت، دن کے لگ بھگ تین بجے، مقام، مغل روڈ' پیر کی گلی سے اس طرف، لگ بھگ تیس کلومیٹر کے فاصلے پر، سرِ راہ کتا' جسے یہ معمر خاتون، کتا کہہ کر نہیں، بلکہ شیر کہہ کر مخاطب کرتی تھی، غائب ہو گیا۔

خان صاحب نے، اس انفارمیشن کو ایک دو بار پڑھ کر دہرایا بھی۔ تسلی ہو جانے پر، وہ اٹھ کر اپنی کرسی پر بیٹھ کر کسی کو فون لگانے لگے۔

خان صاحب:۔ کرنل راوت صاحب بول رہے ہیں؟ کرنل صاحب کیسے ہیں آپ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟ پہلے آپ یہ بتائیے ۔۔۔۔۔ کہ آرمی والوں نے کتوں کو کب سے لاپتہ کرنا شروع کر دیا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟ یار غور سے سنو ۔۔۔۔۔ سوموار ۔۔۔ ۱۹ر ستمبر ۔۔۔ دن کے تین بجے ۔۔۔۔ مغل روڈ ۔۔۔۔۔ پیر کی گلی سے ۔۔۔۔۔ اس طرف ۔۔۔۔۔ لگ بھگ تیس کلو میٹر ۔۔ ایک معمر گجر بکروال عورت ۔۔۔۔۔۔۔ اپنے ریوڑ کے ساتھ ۔۔۔۔۔۔۔۔ گذر رہی تھی جس کا کالے رنگ کا ۔۔۔ چار سال کا ۔۔۔۔۔۔ موٹا تازہ کتا ۔۔۔۔۔ لاپتہ ہو گیا ہے۔ کتا آپ کے جوانوں کے پاس ہے جنہوں نے، اسے اپنے اصلی مالک کو واپس لوٹانے سے منع کر دیا ہے۔ وہ معمر خاتون اسوقت میرے پاس بیٹھی ہوئی ہے اس کتے کو فوراً میرے پاس لایا جائے ۔۔۔۔۔۔۔۔ میں آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔'' او کے، گوڈ بائی کرنل راوت۔ اس کے بعد خان صاحب نے فون رکھ دیا۔

شام کے چھ بج چکے تھے۔ میں اور خان صاحب باہمی گپ شپ میں مصروف تھے اور وہ

معمر خاتون اطمنان کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ اچانک دروازہ کھلا اور ایک آرمی آفسر سلوٹ مار کر گڈ آفٹرنون کہتا ہوا اپنے اسکارڈ کے ساتھ کمرے میں داخل ہو گیا۔ ان کے ساتھ سیاہ رنگ کا ایک کتا بھی تھا۔

معمر گجر خاتون کی چیخ نکل گئی ''میرا بیٹا ۔۔۔۔میرا شیر۔۔۔۔۔۔۔۔۔ا؟'' کتا دم ہلا کر اپنی مالکن کے پاس گیا اور اسے چومنے چاٹنے لگا۔''

خاںؔ صاحب نے اطمنان کی سانس لی' معمر خاتون پھولے نہیں سمائی' کتا اپنے آبائی گھر اور اپنے اصلی مالک کے سپرد کیا گیا' کرنل راوت نے اپنی زمہ داری پوری کی اور اپنا وعدہ نبھایا' اور سب سے بڑھ کر خاں صاحب۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔نے اپنا فرض منصبی ادا کیا اور احسن طریقے سے ادا کیا۔

سب لوگ اپنی اپنی منزل کی طرف جانے لگے، اب آفس میں صرف میں اور خاںؔ صاحب ہی رہ گئے تھے۔ مجھے خاں صاحب نے یہ کہہ کر روکا تھا کہ وہ مجھے اپنی سرکاری گاڑی میں، میرے ڈھیرے تک لفٹ دینے والے تھے کیونکہ وہ گھر جاتے وقت اسی راستے سے گذرنے والے تھے جہاں میرے میزبان کا گھر تھا۔

خاں صاحب اپنا بریف کیس' ٹفن' لیپ ٹاپ' اور کچھ فائلیں وغیرہ سمیٹنے میں مصروف تھے۔ میں ان کے انتظار میں کھڑا تھا۔ میں نے ہمت جٹا کر خاں صاحب سے سوال کیا، خاں صاحب آپ کا حسنِ سلوک' حکمتِ عملی' تدبر و حوصلہ' اپنے فرائض منصبی کی عمل آوری اور سب سے بڑھ کر، اپنی ذمہ داریوں کا بھرپور احساس ، مجھے آپ سے یہ بات پوچھنے کی جسارت پر اکسا رہا ہے۔ لیکن اگر جان کی امان پاؤں تو عرض کروں؟۔

خاں صاحب، لمحے بھر کے لئے رک کر اور میری طرف گھور کر مسکراتے ہوئے بولنے

لگے۔ ''یار اتنی لمبی تمہید ------۔ چہ معنی دارد؟ صاف صاف کہہ دو کیا کہنا چاہتے ہو؟

''بات یہ ہے، جو میں اپنے قریبی، دوست احمد یار خاں سے نہیں؟ بلکہ کریم گنج کے ڈی سی صاحب سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ ایک کتے کے لاپتہ ہو جانے پر وہ اپنے آفس میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر، ایک ٹانگ پر، تب تک کھڑے رہے، جب تک نہ اس کا سراغ لگا لیا۔ لیکن آپ کے ڈسٹرکٹ کریم گنج میں، آج تک جو آٹھ سو اکتالیس انسان لاپتہ ہیں ان میں آج تک ایک بھی ٹریس آوٹ نہیں ہوا؟ انہیں زمین کھا گئی ہے یا آسمان نگل گئی ہے اور یہ جو کئی جگہ پر، گمنام قبرستان دریافت ہوئے ہیں، ان کا ----------؟؟ کیا میں کریم گنج کے ڈی سی صاحب سے یہ پوچھنے کی جسارت کروں؟ کہ لاپتہ ہونے والے، کتے اتنی جلد کیوں مل جاتے ہیں؟ لاپتہ ہونے والے انسان کیوں نہیں -----!!؟؟_

کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد، خاں صاحب نے اپنا سر قدرے جھکا کر، عینک کے اوپر سے جھانکتے ہوئے میری طرف دیکھ کر، دھیمی آواز میں جواب دیا ''کیونکہ کتے دہشت گرد نہیں ہوتے ---!!؟؟''



کتے دہشت گرد نہیں ہوتے؟ (۲)۔

نحیف و عمر رسیدہ گجر خاتون زار و قطار رو رہی تھی، ''جناب مجھے میرا شیرو چاہئے ---------؟' مجھے میرا شیرو چاہئے-----؟ میرے ----۔ شیرو کو وہ،----اٹھا کر لے گئے---۔میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی---۔' میرا شیرو--- میرے بڑھاپے کی لاٹھی ہے-----؟۔

شیرو، اس روتی سسکتی ہوئی معمر خاتون کا کتا ہے۔ جو کئی روز قبل شوپیاں سے پونچھ آتے ہوئے مغل روڑ کے، ایک پڑاؤ سے غائب ہو گیا ہے۔ تب سے یہ بزرگ خاتون انتہائی پریشان ہے۔

انتظامیہ کے مختلف عہدوں پر فائز رہنے کے بعد، نہ جانے کیسے کیسے مسائل و معاملات سے واستہ پڑتا ہے۔ کبھی کبھی بہت کوفت ہوتی ہے۔ اپنا ضمیر ہی، کسی ملٹری ڈکٹیٹر کی طرح، مضمحل روح پر اسطرح، بے دردی سے کوڑے برسانے لگتا ہے کہ روح کی گہرائیوں سے، کائنات کو ہلا دینے والی چیخیں اور آہیں، نکلنی شروع ہو جاتی

ہیں کہ دور دور تک، درد و کرب سے کراہنے اور تڑپنے کی آوازیں، ارتعاش سا پیدا کر دیتی ہیں اور انصاف کے ترازو کا ایک پلڑا اوپر آجاتا ہے تو دوسرا نیچے چلا جاتا ہے۔ اسے ہمیشہ برابری پر برقرار رکھنے کی تگ و دو اور سعی و کوشش کی جہد مسلسل مجھے ہمیشہ ہی منہمک و پریشاں رکھتی ہے کبھی اپنی ذاتی اور باطنی بے بسی آڑے آجاتی ہے تو کبھی منصب اور عہدے کی ذمہ داریاں اور نوکری کے لوازمات و شرائط۔۔۔۔۔خیر جوں توں کر کے یہ معاملہ اسی طرح سے آگے بڑھتا ہے اور بڑھتا ہی رہیگا۔ اور زندگی کی یہ گاڑھی یونہی آگے چلتی رہیگی جب تک اسے آگے چلنا ہو۔

کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ میں بہت غلط جگہ پر آکے پھنس گیا ہوں۔ روٹی روزی حاصل کرنے اور زندہ رہنے کے لئے کوئی معلمی یا پھر تجارت میں خود کو لگا دیا ہوتا تا کہ روز روز ایسے معاملات نہ دیکھنے پڑتے؟ جن کو سن کر یا دیکھ کر بے انتہا دکھ ہوتا ہے اور روحانی کرب اور تکلیف محسوس کرتا ہوں۔ ہاں یہ بات بھی ہے کہ ایسے مواقع بھی آجاتے ہیں، بلکہ روز روز آجاتے ہیں جب اپنے موجودہ منصب وزمہ داریوں اور وطیرہ و کارکردگی پر فخر بھی محسوس ہوتا ہے۔ اللہ تکبر سے بچائے، واقعی ہم نے اپنی محنت و مشقت اور لگن سے کچھ کر دکھایا۔ ہاں جو کرنا چاہتے تھے وہ نہ سہی، لیکن اتنا کچھ بھی کم نہیں ہے۔

بات اس روتی سسکتی بوڑھی عورت کی چل رہی تھی۔ اس کے گمشدہ کتے کی مکمل تفصیل و کوائف معلوم کرنے کے بعد، پتہ چلا کہ اس کا کتا اس سرحدی مقام پر تعینات آرمی والوں کے پاس ہے جو اسے اپنے مالک کو واپس کرنے سے انکاری ہیں۔

کل ہی سیکورٹی بریفنگ کی ماہانہ میٹنگ میں، کرنل راوت سے تفصیلی ملاقات ہو چکی ہے۔ میں نے فون پر تمام معلومات کرنل صاحب کو فارورڈ کر دئے اور یہ تاکید بھی کی کہ کتا کسی بھی حالت میں مجھے واپس چاہیے اور آج ہی چاہیے۔

میں سوچنے لگا کہ ایک مفلس و غریب خاتون، کتے کے لئے کتنا پریشان

ہو رہی ہے اور کل ہی میرے ڈسٹرکٹ میں، جسکا میں ڈی سی ہوں، ایک بیٹے نے اپنے امیر والد سے پیسے اینٹھنے کے لئے اسے قتل کر دیا اور روز میرے پاس کتنے والدین اپنے بچوں کے تشدد اور مار پیٹ کی شکایات لے کر آجاتے ہیں یہی حال بھائی بہنوں اور دیگر قریبی رشتہ داروں کا ہے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے نظر آتے ہیں نہ خونی رشتوں کا ہی کچھ لحاظ ہے اور نہ ہی انسانیت کا کوئی پاس یا احترام ہے۔ انسان جیسے وحشی بنتا جا رہا ہے۔ اپنی سرداری اور چودراہٹ قائم رکھنے اور اپنے مفادات کی خاطر جیسے اندھا بن چکا ہے۔ یہ معمر گجر خاتون شیرو کے لئے ہلکان ہوئی جارہی ہے جیسے شیرو ایک حقیر کتا نہیں، اس کا کوئی سگا سمبندھی ہے۔۔۔۔۔؟

میں نے اس بزرگ خاتون کے روکھے سوکھے چہرے پر، قدرے حقارت سے ہی اپنی نظریں گاڑھ دیں جو میرے روبرو بیٹھی ہوئی تھی۔۔۔۔۔ لیکن فوراً میرے ضمیر نے مجھے جھنجھوڑا اور مجھے یاد دلایا کہ یہ بھی تو اللہ تعالیٰ کی ہی مخلوق ہے جیسے کہ ہم لوگ ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی کوئی مخلوق حقیر نہیں ہے ہاں یہ ہم لوگ ہیں جو اسے ایسا بناتے ہیں۔

حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ روایت کرتے ہیں کہ حضرتِ جنیدِ بغدادیؒ جہاں جہاں بھی وعظ و تبلیغ کے لئے تشریف لے جاتے تھے وہاں وہاں ایک کتا سونگھ کر پہنچ جاتا تھا اور ان کی طرف، بڑی توجہ کے ساتھ، خاموشی سے منہمک رہتا تھا اور انہیں تکتا رہتا تھا اور تب تک ایک خاص انداز میں وہاں بیٹھا رہتا تھا جب تک نہ حضرتِ جنیدؒ وہاں سے فارغ ہو کر چلے جاتے۔

حضرتِ جنیدؒ اس کتے کو بہت دنوں سے دیکھ رہے تھے اور اس کا جائزہ لے رہے تھے اور اس کے، اس جذبے کو محسوس بھی فرما رہے تھے۔ پھر ایسا ہوا کہ حضرتؒ نے اس کتے پر اس طرح توجہ فرمائی کہ اب وہ کتا بھی جہاں بیٹھ جاتا تھا تو

پاس پڑوس کے دس بیس کتے اس کو گھیر کر اسے گھنٹوں تکا کرتے تھے۔

یا پھر وہ واقعہ کہ ایک گناہ گار شخص عرب کے تپتے ہوئے ریگستان میں کہیں جا رہا تھا کہ راستے میں ایک کتیا شدتِ پیاس سے مری جا رہی تھی اس نے اپنے موزے تر کر کے اسے پانی پلایا کہ اللہ تعالیٰ کو اس کا یہ عمل بہت پسند آ گیا اور اسے اس کے عوض جنت بخش دی۔ قرآنِ کریم میں بھی اصحابِ کہف کے کتے کا تذکرہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ان متقی بندوں کی طرح ہی وہ بھی اس غار میں تین سو سال سے بھی زیادہ عرصہ تک سوتا رہا جو ظالم و نافرمان حکمران کے خوف سے اپنے گھروں سے بھاگ کر اس غار میں آئے تھے وغیرہ۔

معمر گجر خاتون کے کتے کی گمشدگی کا کیس میرے لئے، اپنی نوعیت کا پہلا اور انوکھا کیس تھا۔ اس دور دراز اور پسماندہ ڈسٹرکٹ کریم گنج کے ڈی سی کا عہدہ سنبھالنے کے بعد میرے پاس مال مویشیوں، یہاں تک کہ انسانوں کی گمشدگی کے لاتعداد کیس آئے ہیں اور آج بھی اس طرح کی شکایات درج ہو رہی ہیں۔ لیکن یہ کیس اپنی نوعیت کا پہلا اور انفرادی کیس ہے۔

اب لگ بھگ دو گھنٹے گذر چکے ہونگے اس دوران میں نے سائلہ کو ایک دو بار چائے بھی پلوائی کہ اچانک کرنل راوت کا اسکارڈ ایک سیاہ رنگ کے کتے کو میرے دفتر میں لے آیا جسے دیکھ کر معمر گجر خاتون بے اختیار ہو کر چلائی، "۔۔۔۔میرا شیرو آ گیا!، میرا شیرو آ گیا۔۔۔۔" اور اسے گلے سے لگایا، بالکل ایسے جیسے اپنے گمشدہ بیٹے کو گلے سے لگا رہی ہو۔ شیرو بھی دم ہلا ہلا کر اپنی مالکن کو چومنے چاٹنے لگ گیا۔ یہ منظر واقعی دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا کہ ہم سب لوگ بھی نم دیدہ آنکھوں سے، خاموشی کے ساتھ، یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔

انتظامیہ کے ذمہ دار عہدوں پر فائز رہنے کے دوران، پورے سروس کیریئر

میں ایسا پہلی بار ہوا ہے کہ پچھلے تین ماہ سے بھی زیادہ عرصہ سے، میرے ٹیبل پر کوئی فائل رکا پڑا ہو، میں اس ریاست کے ہر اس محکمے میں بدنام یا مشہور ہوں کہ میں شام، تب تک اپنے آفس سے، گھر نہیں جاتا جب تک نہ میں اپنے ٹیبل پر پڑا ایک ایک فائل کا نمٹارا نہ کروں۔ صرف یہ فائل میرے لئے سوہانِ روح بنا ہوا ہے۔ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں اس کا کیا کروں؟۔

روز روز اس کی طرف نظر پڑتے ہی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ فائل نہیں، میری چھاتی پر پڑا ایک ناقابلِ برداشت بوجھ ہے۔ جسے میں ہٹا نہیں سکتا۔ بہر حال یہ میری مجبوری بھی ہے۔

یہ فائل میرے ڈسٹرکٹ کے تمام تحصیلوں کے حاکموں کی زوردار سفارشوں سے سجا سنورا فائل ہے جس میں انہوں نے اپنی مسلسل ومتواتر یاداشتوں سے، اپنے اپنے تحصیلوں میں کتوں کی زبردست بڑھتی ہوئی تعداد کو قابو میں رکھنے اور ان کی قابلِ تشویش بڑھتی ہوئی تعداد کو کم کرنے کے لئے انہیں وسیع پیمانے پر زہر دے دے کر ٹھکانے لگانے کی اجازت طلب کی ہے کہ کتوں نے تقریباً ہر جگہ پر دہشت سی پھیلا رکھی ہے۔ لیکن ذاتی طور پر، میری سوچ، ان سفارشات کے بالکل برعکس یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی مخلوق نہ حقیر ہے اور نہ ہی بری یا کم اہم۔ یہ ہم لوگ ہیں جو اسے ایسا بناتے ہیں، انسان بھی ایک مخلوق ہی ہے اسے کسی دوسری مخلوق کو مارنے کا قطعی کوئی حق نہیں ہے خاص طور پر، اس لئے بھی، جب وہ اشرف المخلوق کہلائے جانے کا شرف بھی رکھتا ہو، اسلئے میں ہاں یا نا کرنے کے سلسلے میں لاتعداد اندیشوں اور تذبزب میں مبتلا ہوں اور اپنے ضمیر کے مطابق کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا ہوں، اسی لئے یہ فائل میرے ٹیبل پر رکا پڑا ہے۔

بزرگ گجر خاتون اپنے شیرو کو لے کر گھر کی طرف روانہ ہو چکی تھی

پاس پڑوس کے دس بیس کتے اس کو گھیر کر اسے گھنٹوں تکا کرتے تھے۔

یا پھر وہ واقعہ کہ ایک گناہ گار شخص عرب کے تپتے ہوئے ریگستان میں کہیں جا رہا تھا کہ راستے میں ایک کتیا شدتِ پیاس سے مری جا رہی تھی اس نے اپنے موزے تر کر کے اسے پانی پلایا کہ اللہ تعالیٰ کو اس کا یہ عمل بہت پسند آ گیا اور اسے اس کے عوض جنت بخش دی۔ قرآنِ کریم میں بھی اصحابِ کہف کے کتے کا تذکرہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ان متقی بندوں کی طرح ہی وہ بھی اس غار میں تین سو سال سے بھی زیادہ عرصہ تک سوتا رہا جو ظالم و نافرمان حکمران کے خوف سے اپنے گھروں سے بھاگ کر اس غار میں آئے تھے وغیرہ۔

معمر گجر خاتون کے کتے کی گمشدگی کا کیس میرے لئے ، اپنی نوعیت کا پہلا اور انوکھا کیس تھا۔ اس دور دراز اور پسماندہ ڈسٹرکٹ کریم گنج کے ڈی سی کا عہدہ سنبھالنے کے بعد میرے پاس مال مویشیوں، یہاں تک کہ انسانوں کی گمشدگی کے لاتعداد کیس آئے ہیں اور آج بھی اس طرح کی شکایات درج ہو رہی ہیں۔ لیکن یہ کیس اپنی نوعیت کا پہلا اور انفرادی کیس ہے۔

اب لگ بھگ دو گھنٹے گذر چکے ہونگے اس دوران میں نے سائلہ کو ایک دو بار چائے بھی پلوائی کہ اچانک کرنل راوت کا اسکارڈ ایک سیاہ رنگ کے کتے کو میرے دفتر میں لے آیا جسے دیکھ کر معمر گجر خاتون بے اختیار ہو کر چلائی، "۔۔۔۔میرا شیرو آ گیا!، میرا شیرو آ گیا۔۔۔۔" اور اسے گلے سے لگایا، بالکل ایسے جیسے اپنے گمشدہ بیٹے کو گلے سے لگا رہی ہو۔ شیرو بھی دم ہلا ہلا کر اپنی مالکن کو چومنے چاٹنے لگ گیا۔ یہ منظر واقعی دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا کہ ہم سب لوگ بھی نم دیدہ آنکھوں سے، خاموشی کے ساتھ، یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔

انتظامیہ کے ذمہ دار عہدوں پر فائز رہنے کے دوران، پورے سروس کیریئر

میں ایسا پہلی بار ہوا ہے کہ پچھلے تین ماہ سے بھی زیادہ عرصہ سے، میرے ٹیبل پر کوئی فائل رکا پڑا ہو، میں اس ریاست کے ہر اس محکمے میں بدنام یا مشہور ہوں کہ میں شام، تب تک اپنے آفس سے، گھر نہیں جاتا جب تک نہ میں اپنے ٹیبل پر پڑا ایک ایک فائل کا نمٹارا نہ کروں۔ صرف یہ فائل میرے لئے سوہانِ روح بنا ہوا ہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میں اس کا کیا کروں؟۔

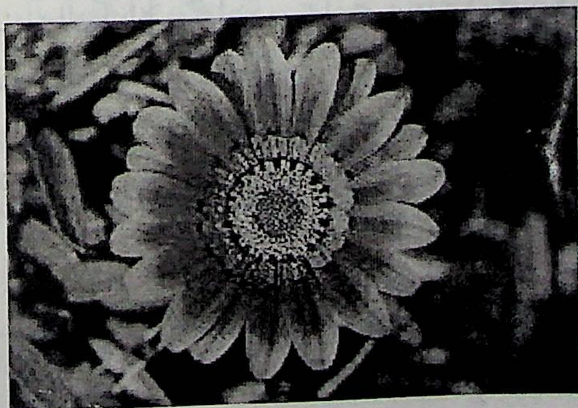
روز روز اس کی طرف نظر پڑتے ہی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ فائل نہیں، میری چھاتی پر پڑا ایک ناقابلِ برداشت بوجھ ہے۔ جسے میں ہٹا نہیں سکتا۔ بہر حال یہ میری مجبوری بھی ہے۔

یہ فائل میرے ڈسٹرکٹ کے تمام تحصیلوں کے حاکموں کی زوردار سفارشوں سے سجا سنورا فائل ہے جس میں انہوں نے اپنی مسلسل و متواتر یادداشتوں سے، اپنے اپنے تحصیلوں میں کتوں کی زبردست بڑھتی ہوئی تعداد کو قابو میں رکھنے اور ان کی قابلِ تشویش بڑھتی ہوئی تعداد کو کم کرنے کے لئے انہیں وسیع پیمانے پر زہر دے کر ٹھکانے لگانے کی اجازت طلب کی ہے کہ کتوں نے تقریباً ہر جگہ پر دہشت سی پھیلا رکھی ہے۔ لیکن ذاتی طور پر، میری سوچ، ان سفارشات کے بالکل برعکس یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی مخلوق نہ حقیر ہے اور نہ ہی بری یا کم اہم۔ یہ ہم لوگ ہیں جو اسے ایسا بناتے ہیں، انسان بھی ایک مخلوق ہی ہے اسے کسی دوسری مخلوق کو مارنے کا قطعی کوئی حق نہیں ہے خاص طور پر، اس لئے بھی، جب وہ اشرف المخلوق کہلائے جانے کا شرف بھی رکھتا ہو، اسلئے میں ہاں یا نا کرنے کے سلسلے میں لاتعداد اندیشوں اور تذبذب میں مبتلا ہوں اور اپنے ضمیر کے مطابق کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا ہوں، اسی لئے یہ فائل میرے ٹیبل پر رکا پڑا ہے۔

بزرگ گجر خاتون اپنے شیرو کو لے کر گھر کی طرف روانہ ہو چکی تھی

اور کرنل راوت اپنے اسکارڑ کے ساتھ اپنی راہ لے چکے تھے۔شام کے چھ بج رہے تھے اب آفس میں اور میرے ٹیبل پر مجھے گھورتا ہوا یہ فائل تھا۔میں اطمنان کے ساتھ اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور میں نے اس فائل کو کھول کر جلی حروف میں لکھ دیا کہ ''کتے دہشت گرد نہیں ہوتے'' دوسرے دن وہ فائل میرے ٹیبل سے ہٹ گیا تھا۔







نیلی رگوں والے پیلے ہاتھ

مرزا غالبؔ نے خط پڑھتے ہوئے قدرے حقارت سے وہ رکھ دیا اور اپنے شاگردِ رشید میر مہدی مجروحؔ کی طرف چہرہ کر کے کہنا شروع کر دیا۔

"کتنے بدذوق لوگ ہیں گالی دینا بھی نہیں آتا؟"

میر مہدی مجروحؔ نے پوچھا! "استاد کیا بات ہوگئی؟!"

بھائی بوڑھے آدمی کو ماں بہن کی گالی تھوڑی ہی دی جاتی ہے؟" مرزا غالبؔ نے جواب دیا۔

کالج کے دنوں میں یہ واقع اپنے اردو ٹیچر مخمور حسین صاحب نے سنایا تھا اور آج تک من و عن یاد ہے۔

آج صبح میرا پوتا عمران میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے میری آنکھوں میں آنسوؤں کی دھارسی دیکھ کر کچھ ایسا ہی سوال مجھ سے کیا۔

"دادو بوڑھے لوگ اپنی ممی کو دیکھ کر یوں رونے لگتے ہیں کیا؟"

میں بت بن کر بھیگی بھیگی آنکھوں سے اسے تکتا رہا اور وہ بھی میری جانب اپنی نظر کسی دوسری جانب ہٹائے بغیر ہی دیکھتا رہا جیسے مجھے سمجھانا چاہ رہا ہو کہ اپنی آنکھوں میں تیرتے ہوئے آنسوؤں کو بہنے سے کیسے روک دیا جاتا ہے۔

معاملہ کوئی خاص نہیں تھا۔ ماں جی آج کچھ زیادہ ہی علیل تھی۔ میں بڑی بڑی بے نور آنکھوں والا اس کا پرنور چہرہ دیکھ کر نہیں رویا تھا۔ اس نے اپنے دونوں لاغر و کمزور ہاتھ لحاف سے باہر نکال کر اپنی چھاتی پر رکھ دئے تھے۔ جیسے نماز کے دوران اکثر رکھا کرتی تھی۔

'پیلے ہاتھ' جی ہاں' پیلے ہاتھ' یہ وہ پیلے ہاتھ نہیں تھے جو دلہن اور کنواری نوجوان لڑکیوں کے مہندی یا ہلدی سے پیلے کر دئے جاتے ہیں؟ بلکہ متوازن خوراک کی کمی سے' جسم میں خون کی مطلوبہ مقدار کم ہو جانے کی وجہ سے' خون کی کمی کے باعث' پیلے پڑ جاتے ہیں۔ ماں جی نے' خاص طور پر' ابا جی کے انتقال کے بعد مفلسی اور غربت کی وجہ سے' پیروں فقیروں کی طرح ہی' بس کچھ کلو کھانا ہی' سانسوں کی ڈوری کو قائم رکھنے کے لئے' انتہائی ضرورت کے باعث زندہ رہنے کے لئے' استعمال کیا ہوگا۔ ماں جی نے یہ پیلے ہاتھ کھلے ہوئے اور پھیلا کر رکھ دئے تھے۔ اوپر پانچوں انگلیوں کی ہڈیاں اور جوڑ اسطرح دکھ رہے تھے کہ گنے جا سکتے تھے اور ان پر' جیسے کھال کے دستانے پہنا دئے گئے ہوں۔ کھردری اور جھریوں والی کھال کے نیچے خون کی نیلی نیلی رگیں اچھی طرح سے دکھ رہی تھیں۔

ہم تین بہنیں اور ایک بھائی تھے۔ میری تین بہنیں مجھ سے عمر میں بڑی تھیں۔ ماں جی بتاتی تھی کہ میں اس وقت صرف تین سال کا تھا جب والد صاحب ایک حادثاتی موت میں فوت ہو گئے تھے۔ ان کے اچانک انتقال کی خبر نے پورے خاندان پر بجلی سی گرائی تھی۔ بہت دنوں تک والدہ اور بہنیں اس صدمے سے سکتے میں آ گئی

تھیں۔رشتہ داروں کی پوری فوج بھی صدمے میں شریک تھی۔ پھر رفتہ رفتہ سب لوگ اپنے اپنے کام دھندوں میں مصروف ہو گئے اور ہم لوگ تنہا رہ گئے۔ نہ کوئی آگے تھا اور نہ پیچھے اور اگر کوئی تھا تو وہ اللہ تھا بس۔ جس کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ بے نیاز ہے۔

ماں جی نے کتنی ہمت دکھائی؟ کتنے حوصلے سے کام لیا۔ایک غیرت مند عورت کی طرح مردانہ وار ہر مصیبت سے تنہا لڑتی رہی۔اپنے ان دو ہاتھوں سے نہ جانے کتنا پشمینہ کات کات کر ہم بھائی بہنوں کی پرورش کرتی رہی۔ چرخا گھما گھما کر انگلیاں گھس گئیں۔پشمینہ ، کنگی پر صاف کرتے کرتے ان میں دراریں سی پڑ گئیں۔راتوں کو مسلسل چرخا کات کات کر آنکھوں کی بصارت جاتی رہی۔لیکن پھر بھی ہمت نہیں ہاری اور ہر لمحہ ہر پل بس ایک ہی دھن ذہن پر سوار رہتی تھی کہ بچیوں کا نکاح ہو اور لڑکا پڑھ لکھ کر چار پیسے کمانے کے لائق بن جائے۔

لحاف سے باہر ماں جی کے یہ کمزور و ناتواں ہاتھ مجھے کتنے عظیم لگ رہے ہیں ان پر نظر پڑتے ہی بچپن سے بڑھاپے تک کے سارے معاملات، سارے واقعات، فلم کی طرح میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے اور بے اختیار ہو کر میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کا خیال نہ ہوتا، تو میں ماں جی کے ان ہاتھوں کو دیوانہ وار چوم لیتا اور چومتا ہی رہتا۔لیکن میرا پوتا۔۔۔۔۔۔۔؟؟!!۔

مجھے اچھی طرح سے یاد ہے جیسے کل ہی کی بات ہو۔ گرمی کے دن تھے اور چاندراتیں۔ میں اسکول میں پڑھ رہا تھا۔ہمارا گھر بھی ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ دو بہنوں کی شادی ماں جی نے جوں توں کرادی تھی اور اب تیسری بہن کی شادی سر پر سوار تھی پیسوں کی ضرورت کچھ زیادہ ہی آن پڑی تھی۔کمرے کی کھڑکیاں کھلی تھیں اور ماں جی اپنے پرانے اور بوسیدہ چرخے پر پشمینہ کات رہی تھی۔

میں ہڑبڑاہٹ میں اُٹھ کر جلدی جلدی کرتہ پہننے لگا کہ دن چڑھ آیا ہے۔ نیند کے غلبے سے پتہ ہی نہیں چلا۔۔۔۔؟ اور فجر کی نماز بھی چھوٹ گئی؟۔

ماں جی چرخا روک کر مسکرا کر کہنے لگی۔ "بیٹے ابھی رات کے اڑھائی ہی بج گئے ہیں ۔ چاندرات ہے اسی لئے باہر روشنی سی نظر آ رہی ہے؟ تم سو جاؤ میں فجر کی نماز سے زرا قبل ہی جگاؤ نگی؟۔

جوں توں کر کے میں اس وقت سو تو گیا۔ لیکن نمازِ فجر پڑھنے کے بعد جب میں مسجد سے لوٹا تو میں نے اسکول کا کتابوں کا بستہ سامنے لاکر کاپیاں اور کتابیں رورو کر یہ کہتے ہوئے پھاڑنی شروع کر دیں کہ میں اب ہرگز اسکول نہیں جاؤں گا۔ کوئی کام دھندا شروع کروں گا تا کہ ماں جی کو آج کے بعد ہمارے لئے راتوں کی نینداور دن کا چین گنوانا نہ پڑے اور یوں مسلسل اور متواتر چرخا چلانا اور پشمینہ کا تنانہ پڑے۔

ماں جی اپنی جگہ سے اٹھ کر اپنے اور میرے آنسوں پونچھنے لگی۔ پھر مجھے سینے سے لگا کر چومنے لگی اور تسلی دے دے کر بار بار کہنے لگی کہ "بیٹا میں ہی کیوں تمہارے ابا بھی یہی چاہتے تھے کہ تم پڑھ لکھ کر ایک بہت ہی اچھے انسان بن جاؤ۔ کیونکہ تم ہمارے اکلوتے بیٹے ہو۔ دیکھو بیٹا تمھارے ابا ہوتے تو شاید اتنا پریشان نہ ہونا پڑتا۔۔۔۔۔۔؟ مگر کیا کروں میری تقدیر ہی بری تھی۔۔۔۔۔۔۔ جو تمہیں آج یہ دن دیکھنے پڑ رہے ہیں۔۔۔؟ لیکن بیٹا ہمت رکھو جس طرح تمہاری یہ ماں رکھ رہی ہے۔۔۔؟ یہ دن ضرور ٹل جائینگے اور اچھے دن آئینگے بیٹا اگر تم ہی نے ہمت ہار دی تو پھر ہمارا کیا ہوگا۔۔۔۔۔۔؟ اس کے بعد ماں جی آنسوؤں کے سیلِ رواں میں جیسے تیر گئی اور اس سے آگے اس سے پھر کچھ بھی نہ کہا گیا کچھ بھی نہیں اور میں۔۔۔۔۔۔؟ مجھے لگا کہ آج ہی نا کہاں میرے ابو کا انتقال ہو گیا جنہیں میں نے اچھی طرح سے دیکھا بھی نہیں تھا کہ ان کی صورت، میرے ذہن کے محافظ خانے میں جیسے اچھی طرح سے موجود اور نقش

بھی نہیں ہے۔

ماں کتنی اچھی ہوتی ہے، کتنی عظیم ہوتی ہے کہ خود لاکھ آنسو بہائے اور کوئی اس کے آنسو پونچھنے والا ہو یا نہ ہو اپنی اولاد کے آنسو اس سے دیکھے نہیں جاتے۔ماں جی نے میرے آنسو پونچھتے ہوئے مجھے گلے سے لگایا اور میں نے بھی اپنے ہاتھوں کی پکڑ کس لی تھی.

اور آج ۔۔۔۔۔؟ میرے سامنے بے حس و حرکت پڑے ہوئے انہی نیلی رگوں والے پیلے ہاتھوں نے کتنی بار مجھے کھلایا پلایا نہلایا سلایا بہلایا سہلایا اور۔۔۔۔میری آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کو صاف کیا۔ ماں کی ممتا کا کچھ نعم البدل ہوسکتا ہے بھلا؟۔

میں نے اپنی کٹی پھٹی کتابیں اور کاپیاں اپنے پھٹے پرانے بیگ میں واپس رکھنا شروع کر دیا تھا اور پڑھائی میں اسقدر منہمک و مشغول ہو گیا تھا کہ مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ میں کیسے اور کس طرح سرکاری آفسر بن گیا۔

بالآخر ماں جی کی سخت اور جسم گھلا دینے والی محنت و مشقت رنگ لائی تھی اور اس کی دعاؤں کا اثر بھی کہ پڑھائی مکمل کرتے ہی مجھے وہ سب کچھ مل گیا جس کی ہم دونوں ماں بیٹے نے تمنا اور خواہش کی تھی۔

اور اب ۔۔۔۔۔۔۔؟ جب کہ میں، ماں جی کے انگنت احسانوں کی ایک ایک پائی چکانے والا تھا یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں اگر ایک سو بار نہیں ایک ہزار بار بھی جنم لوں تو ماں کے صرف ایک احسان کا بھی بدلہ نہیں چکا پاؤں گا اور نہ ہی اس کا حق ادا کرسکوں گا تو ماں جی۔۔۔۔۔۔۔؟؟!!۔

اباجی کے انتقال کے بعد، ماں جی کو، اپنی تین بیٹیوں کی شادی پر، ہماری مکمل پرورش پر، گھر گرہستی کی لاکھ پریشانیوں سے نمٹتے وقت، میری تعلیم و تربیت کے دوران، کن کن کٹھن مراحل سے گذرنا پڑا؟ وہ سب بیان سے باہر ہے لیکن پھر بھی لاتعداد واقعات پرت در پرت اور تہہ در تہہ میری فکر و سوچ اور یاداشت میں محفوظ اور

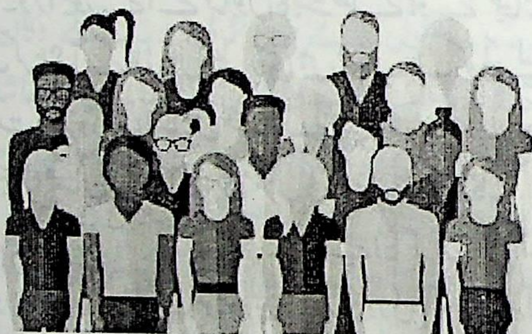
موجود ہیں۔ جیسے یہ سب کل ہی کی بات ہو۔شاید میں پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے انہیں بیان کر کے اپنے سینے پر پڑے پربت جیسے بوجھ کو کچھ ہلکا بھی کر دیتا لیکن۔۔۔۔۔۔میرا پوتا، ابھی تک چور نگاہوں سے مجھے گھور رہا تھا۔اور آس پاس بیٹھے یہ۔۔۔۔۔۔۔لوگ؟!۔

میں نے طے کرلیا کہ میں ماں جی کے ان نیلی رگوں والے پیلے ہاتھوں کی طرف نہیں دیکھوں گا۔ ماں جی کے سرہانے بیٹھی ہوئی میری بڑی بہن نے نہ جانے کیا سوچ کر ان ہاتھوں کو ماں جی کو اوڑھائے گئے لحاف کے اندر ازخود ہی ڈال دیا جیسے میرے ماضی پر پردہ ڈال دیا جو مجھے اندر ہی اندر کرید کرید کر سب کچھ یاد دلا رہے تھے۔اب میں ان ہاتھوں کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔

میں نے اپنی دونوں بھیگی ہوئی آنکھیں بند کر کے کمرے کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کچھ دیر تک آرام واطمنان کا سانس لینا چاہا۔

پھر جب اس کے بعد میں نے اپنی آنکھیں دوبارہ کھول دیں تو نہ جانے مجھے ایسا احساس شدت کے ساتھ کیوں ستانے لگا کہ میں ماں جی کے ہاتھوں کو اپنی ان آنکھوں سے اب نہیں دیکھ پا رہا ہوں لیکن وہ نیلی رگوں والے پیلے ہاتھ مجھے لحاف کے اندر سے بھی گھور رہے ہیں۔





ہم لوگ

صبح نو دس بجے اور پھر دوپہر بعد تین چار بجے Peek Hours ہوتے ہیں اور سڑکوں پر بلا کارش اور جمگھٹا رہتا ہے۔ یہ شہر کی تنگ و گنجان سڑکوں اور گلی کوچوں کے لئے بہت ہی مصروف ترین اوقات ہوتے ہیں۔ اسکولوں' کالجوں اور دفتروں کی پوری بھیڑ امڈ آتی ہے اکثر ہر طرف لمبے وقفے تک ناقابلِ برداشت جام لگ جاتا ہے اور قریہ قریہ کھچا کھچ سا دکھائی دیتا ہے کہ سر گھمانے کا موقع بھی نہیں ملتا اور ایک عجیب طرح کی گھٹن سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ گاڑیوں' بسوں' رکھشوں اسکوٹروں وغیرہ میں' لوگ جیسے بھاگتے دوڑتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

مجھے بھی دوپہر بعد ہی' اندرونی شہر کے پرانے گنجان علاقے میں' کلنک پر پہنچنا ہوتا ہے اور اسی بھیڑ بھاڑ سے جوجھنا پڑتا ہے۔ حسب معمول آج بھی

دوپہر بعد میں نے اپنے کلنگ کا رخ کرلیا وہ بھی ایک عام پسنجر بس سے' کہ گاڑی کئی دن سے ورکشاپ میں پڑی ہوئی تھی۔ سیٹ پر میں کھڑکی کی طرف بیٹھا ہوا تھا اور بس شہر کے ایک مصروف ترین بازار سے گزر رہی تھی اور ایک بس اسٹاپ پر رک گئی۔ ڈرائیور کی کھڑکی کھل گئی اور چھوٹی سی ننھی منی بچی خوبصورت اسکولی یونیفارم پہنی ہوئی آہستہ سے نیچے اترنے لگی۔ ڈرائیور نے اسے کتابوں کا بستہ تھماتے ہوئے سمجھانا شروع کردیا کہ بیٹا سڑک پار مت کرنا؟ آگے گاڑیاں چل رہی ہیں؟ جب تک کوئی لینے نہ آئے' تب تک ادھر سے ہٹنا مت وغیرہ؟ اسی اثنا میں عقب سے ایک عورت نمودار ہوکر اس بچی کا ہاتھ پکڑنے لگی اور ڈرائیور اطمنان کے ساتھ اپنی منزل کی طرف بڑھنے لگا۔

میں سوچنے لگا کہ آج بھی انسانیت زندہ ہے اور دوسروں کا دکھ درد سمجھنے والے لوگ موجود ہیں۔ ڈرائیور کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ بظاہر اس کا' اس بچی کے ساتھ کوئی خونی رشتہ نہیں ہے لیکن پھر بھی وہ اس کے لئے اس قدر فکر مند ہو رہا تھا جیسے اس کی اپنی ہی بچی ہو؟

واقعی ابھی تک ایسے لوگ موجود ہیں جو راہ بھٹکے ہوؤں کو راستہ دکھاتے ہیں اور سواریوں سے بھری بسوں میں بزرگوں اور خواتین کے لئے سیٹیں خالی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دنیا ایسے ہی نیک لوگوں سے قائم ہے ورنہ کب کی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟

حسب معمول میں اپنی جان پہچان والی کریانہ کی دکان پر چائے کی پتی' مصالحہ جات اور دوسرا گھریلو سامان خریدنے کے لئے گیا۔ نوجوان دکاندار' جو میرے ساتھ انتہائی تپاک سے مسکرا کر ملتا تھا آج کچھ بدلا بدلا اور اکھڑا اکھڑا سا محسوس ہو رہا تھا اور ایک عجیب موڑ میں مجھ سے مخاطب ہوا۔ اس کا لب ولہجہ بجھا بجھا سا اور مایوس کن تھا۔ اس غیر متوقعہ برتاؤ کی وجہ۔۔۔۔۔۔؟؟

میں ابھی اسی تذبذب میں تھا؟ کہ وہ' میرے استفسار کے

بغیر ہی مجھ سے مخاطب ہو گیا۔

"اینکل جی کیا بتاؤں اور کیسے بتاؤں؟ کچھ کہتے ہوئے شرمندگی محسوس ہوتی ہے۔ یہ کہنے والی بات بھی نہیں ہے؟ ہم لوگ کتنے گر چکے ہیں؟ معلوم نہیں؟ ہم لوگ کہاں جارہے ہیں اور ہمارا انجام کیا اور کیسا ہوگا؟ ۔۔۔۔۔۔۔۔آج صبح کی بات ہے۔دکان کھولتے ہی۔۔۔۔۔۔۔۔ایک بارہ چودہ سال کی۔۔۔۔۔۔ اسکول جانے والی لڑکی۔۔۔۔ نے دکان پر مجھے اکیلا پاکر۔۔۔۔۔۔ایک کاغذ کا سلپ تھمادیا۔ابتدا میں۔۔۔۔۔میں یہ سمجھا شاید کوئی گاہک ہے اور چیزوں کی لسٹ تھمارہا ہے۔لیکن، جب تک میں نے وہ سلپ پڑھا، تب تک وہ لڑکی پاس والی گلی سے نکل کر میری آنکھوں سے اوجھل بھی ہو چکی تھی۔

سلپ پر تحریر، چند سطور نے، جیسے مجھے جہنم کی تپتی ہوئی آگ میں دھکیل دیا۔میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔دل اور دماغ ماؤف ہو کر رہ گیا اور میں انتہائی حقارت کے ساتھ، اپنے آپ کو ایسے کوسنے لگا جیسے اس سارے واقعے کا اصل قصوروار میں ہی ہوں۔انتہائی ندامت اور شرمندگی ہے کہ ہم لوگ کہاں تک گر چکے ہیں۔

صبح سے لیکر آپ کے آنے تک، میں اسی سکتے کی کیفیت میں رہا اور مجھے کچھ پتہ ہی نہیں کہ دکان پر آنے جانے والے گاہک مجھ سے کیا مانگتے رہے اور میں کیا باندھتا رہا؟ آپ کو دیکھ کر ذرا سی تسلی ہوئی اور اس واقعے کو آپ کے ساتھ شئر کر کے مجھے، کچھ ہلکا ہلکا سا محسوس ہو رہا ہے اور میرے سینے کا بوجھ بھی، کچھ کم ہونے لگا ہے۔۔۔۔"

اس کی بات ابھی جاری ہی تھی کہ مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے پوچھ ہی ڈالا۔"بھائی آخر اس کاغذ کے سلپ پہ کیا لکھا ہوا تھا؟"

اس نے کچھ کہے بغیر ہی، اپنے سامنے سے وہ کاغذ کا سلپ اٹھا کر میرے ہاتھ میں تھما دیا۔جس پر صاف صاف حروف میں تحریر تھا۔" آپ

مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔آپ مجھے پانچ ہزار روپئے دے کر' جہاں چاہیں اور جب چاہیں بلا سکتے ہیں! میرا موبائل نمبر.......... ہے۔میں آپ کے فون کا انتظار کروں گی۔"

ہم دونوں' نظریں نیچے کئے ہوئے کسی گہری سوچ میں پڑ گئے۔میں سوچ رہا تھا کہ ہم لوگ کتنا گر چکے ہیں؟ پتہ نہیں ہم کہاں جارہے ہیں اور ہمارا انجام کیا اور کیسا ہوگا؟ انسانیت نام کی کوئی چیز ہم میں اب باقی نہیں رہی' ہماری جگہ جہنم کے سب سے نچلے طبقے سے بھی نیچے کسی مقام پر ہوگی۔پتہ نہیں وہ کیا سوچ رہا تھا۔۔۔۔۔۔؟!

قیامت خیز اور تباہ کن سیلاب آنے کے بعد' میں سری نگر میں لال چوک کے مصروف ترین' کوکر بازار سے' سیلاب اترنے کے بعد' پہلی بار گزر رہا ہوں۔اس علاقے کے مکانوں کی پوری ایک منزل' سیلابی پانی کے ریلے سے بھر گئی تھی اور دوسری منزلوں میں بھی پانی بھرنے لگ گیا تھا کہ جیسے کسی نے بے لگام بھاگتے دوڑتے سیلابی ریلے کی لگام کس لی تھی اور وہ قرار میں آکر' کسی کے حکم کی تعمیل کے بعد' رفتہ رفتہ اترنے لگ گیا تھا اور دوسری تیسری منزلوں سے' اس کی حرکات وسکنات کو لمحہ بہ لمحہ جانچنے والی آنکھوں کو قرار آ گیا تھا۔

ہر طرف سے آرہے ایک عجیب قسم کے تعفن اور بدبو سے سر پھٹا جارہا تھا کہ تربتر گلی کوچوں اور سہمے سہمے اور لرزیدہ درودیوار کے بیچ میں گزرنے سے انتہائی خوف اور ڈر محسوس ہو رہا تھا۔جگہ جگہ پر چائے' بادام' کشمش' بسکٹ' ہلدی' مصالحہ جات اور دنیا بھر کی گلی سڑی کھانے پینے کی' چیزوں کی بوریوں کی بوریاں اور دیگر سامان کے ڈھیر لگ گئے تھے اور سارا ماحول سوگوار اور ماتم کناں تھا۔اتفاقاً میں غیر ارادی طور پر اس دکان کے سامنے سے گزرا' جہاں سے میں' مہینے کی پہلی تاریخ کو' گھر کے لئے درکار سودا سلف خرید لیتا ہوں۔دکان میں پڑی ایک ایک چیز خراب وخستہ ہو چکی تھی اور وہ نوجوان دکاندار اپنی کھلی ہوئی دکان کے باہر ہی ششدر د

حیران، کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا کھڑا تھا۔ اچانک اس کی نظریں میرے چہرے پر رک گئیں۔ میرے قدم بھی جیسے خود بخود وہاں پہنچ کر رک گئے حالانکہ میں اس متعفن ماحول سے جلد از جلد بھاگنا چاہتا تھا۔ اس کی نگاہیں کچھ دیر تک میرے چہرے پر ہی ٹکی رہیں اور میں بھی اسے خاموشی کے ساتھ تکتا رہا۔ بیچ میں صرف ایکبار اس کی نظریں دکان کے اس حصے پر بھی گئیں، ۔۔۔ جہاں سے ۔۔۔۔۔ اس نے ۔۔۔۔۔ وہ سلپ ۔۔۔ اٹھایا تھا؟؟!!

پروفیسر عارفہ بشریٰ صدر شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی حضرت بل سری نگر (کشمیر)

کشمیر کے نئے افسانوں میں دیومالا سے بھی استفادہ کیا جارہا ہے اور اساطیری واقعات اور کرداروں کی مدد سے موجودہ عہد کی ذہنی پریشانیوں، جذباتی پیچیدگیوں، ذات پسندی اور داخلیت پسندی کے رجحانات اجاگر کئے جارہے ہیں، چنانچہ نئے افسانہ نگاروں کا بہت اشتیاق اور فن شناسی کے ساتھ آگے کی منزلوں کی طرف سفر جاری ہے، چنانچہ فوری طور پر اپنی اہمیت منوانے والے افسانہ نگاروں میں وریندر پٹواری، شمس الدین شمیم، مالک رام آنند، ڈی کے کنول اور امر مالموہی کے ساتھ ساتھ آنند لہر انیس ھمدانی، راجہ نظر بونیاری، جان محمد آزاد، فاروق رینزو، زاہد مختار، اشرف آثاری اور مشتاق مہدی سر گرمی سے لکھ رہے ہیں۔

مطبوعہ "بزمِ سہارا" دہلی مارچ، ۲۰۱۲ء



ایک اور للّٰہ عارفہ

للیشوری، پنڈت مادھورام کے گھر میں پیدا ہوئی تھی اور پیدا ہوتے ہی اس کی والدہ فوت ہو چکی تھی پھر اس کے والد نے اسے پال پوس کر بڑا کیا تھا کہ ان کے گھر میں اور کوئی نہیں تھا۔ حسن فطرت سے مالا مال اس دور دراز سرحدی گاؤں میں بیس تیس مسلمان گھروں میں، پانچ سات پنڈت گھرانے بھی ابتدا سے ہی آباد تھے اور سب لوگ سکون و اطمنان سے زندگی گزار رہے تھے اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں برابر کے شریک ہوتے تھے۔

ہونی کو کون ٹال سکتا ہے؟ ایک دن پنڈت مادھورام بھی پرلوک سدھار گئے۔ ہوش وحواس سے بے گانہ للیشوری، جسے پیار سے سب لوگ لل کہتے تھے، گارے مٹی سے بنی اپنی پرانی اور بوسیدہ کٹیا میں اب اکیلی رہ گئی تھی۔ پاس پڑوس میں رہنے والے پنڈت تب تک

للّ کی ضرورتوں کا خیال رکھتے تھے جب تک وہ اس گاؤں میں رہ رہے تھے' اور یہاں سے جاتے ہی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟؟

للّ کا غم' پنڈت مادھورام کو بھی کھائے جا رہا تھا کہ اس کے بعد 'اس کی' اسِ بے کس ولاچار اکلوتی بیٹی کا کیا ہوگا؟ جس کا' اس کے سوا نہ کوئی آگے تھا اور نہ پیچھے؟ لیکن پاس پڑوس میں رہنے والے ہمسایوں کی تسلی اور دلاسہ سے کچھ ڈھارس سی بندھ جاتی تھی اور وہ چپ ہو جاتے تھے کہ اسِ کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

پنڈت مادھورام کو مرے ہوئے اب ایک عرصہ گزر گیا اور للّ ایک معصوم کلی سے للّ دید' گاؤں کی بزرگ عورت بن گئی تھی۔ گاؤں کے سب لوگ' چھوٹے بڑے' ہندو مسلمان' اس کی بہت تعظیم و تکریم اور عزت کرتے تھے۔ صرف ایک دن پنڈت لچھمن جو نے اسے ٹوکا تھا کہ کئی دنوں تک صمد چاچا کے پوتے کی شادی میں شریک ہو کر وہیں پر' دھان پان کرنے پر' کہ ان کے نزدیک عیدین اور شادیوں وغیرہ پر گائے کا گوشت پکا کر کھانے والوں کے ہاں دھرم برشٹ ہو جاتا ہے۔

للّ کو ان چیزوں کی سدھ بدھ کہاں تھی؟ کوئی کھلاتا تو کھا لیتی' نہیں تو اوپر والے کی مہمان؟ ان ہی اوصاف کی وجہ سے نہ صرف اپنی ذات برادری کے لوگ ہی' بلکہ سب لوگ اس کی عزت و احترام کرتے تھے اور پھر گاؤں کے لوگوں میں یہی بات تو ہے کہ اپنے سے بڑھ کے دوسرے کا خیال رکھتے ہیں۔

اس سارے بھائی چارے اور آپسی میل ملاپ کو جیسے کسی کی نظر لگ گئی؟ کہ رفتہ رفتہ ابتر حالات کا دائرہ شہروں کی حدود کو پھلانگتا ہوا گلی گلی' گاؤں گاؤں تک پھیل گیا اور اس گاؤں میں بھی ایک بے یقینی کی سی صورتِ حال پیدا ہو گئی۔ اور ایک دن اقلیتی فرقے سے تعلق رکھنے والے سب گھر آناً فاناً خالی ہو گئے اور ان میں رہنے بسنے والے سب لوگ عنقا ہو گئے؟ ایسا کیوں اور کیسے ہوا؟ پتہ ہی نہیں چلا؟ اور اصل حقیقت

آج تک معمہ بنی ہوئی ہے۔

لل دید جوں کی توں اپنی کٹیا میں بلا کسی تغیر و تبدل کے اطمنان وسکون کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ نہ صمد چاچا کے ہاں کھانے پینے سے اس کا دھرم برشٹ کرانے والے پنڈت لچھمن جو ہی اسے اپنے ساتھ لے گئے اور نہ ہی دوسرے پانچ سات اس کی ذات برادری والے گھرانوں میں سے ہی کسی فرد نے یہ زحمت گوارہ کی؟۔

آج سے مکمل طور پر لل دید اس گاؤں کی اور اس گاؤں میں صدیوں سے بود و باش اختیار کرنے والے اکثریتی فرقے کی میراث اور ان کی مکمل ذمہ داری بن گئی کہ گاؤں کے جس شخص سے جو کچھ بن پڑتا تھا۔ وہ اس کے لئے کرتا تھا۔ کسی کے ذمہ صبح کے ناشتے میں مکی کی روٹی اور نمکین چائے پلانا تھا تو کسی کے ذمہ دوپہر میں لسی اور ساگ سبزی کے ساتھ ابلے ہوئے چاول کھلانا تھا۔ کسی کے ذمہ سہ پہر کو ستو اور قہوہ پلانا تھا تو کسی کے ذمہ رات کا کھانا کھلانا۔ حاجرہ چاچی ہفتے میں ایک دوبار اسے نہلاتی اور دھلے ہوئے کپڑے پہناتی تھی تو فاطمہ تائی اس کے بالوں کو سنبھالتی سنوارتی تھی۔ کبھی بیمار پڑتی تھی تو دس خیر و عافیت پوچھنے والے لوگوں کا کٹیا میں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ اور وقت وقت پر دوائی کھلانے کی ذمہ داری بانٹ دی جاتی تھی۔

چونکہ سارا گاؤں مسلمانوں کا تھا اسلئے عیدین اور شادی بیاہوں پر طرح طرح کے پکوان لل دید کے لئے آجاتے تھے۔ دید بھی سب کا دل رکھنے کے لئے ضرور ان کا مزا چکھ ہی لیتی تھی اور دوسروں کے اصرار پر پیٹ بھر کر کھا بھی لیتی تھی کہ آج اس کا دھرم برشٹ کرنے والا پنڈت لچھمن جو' گاؤں میں موجود بھی نہیں تھا۔

دن گزرتے رہے۔ لمحے' گھڑیاں' دن' ہفتے' مہینے اور سال۔۔۔۔۔۔۔؟' ایک دن ہم صبح سویرے گاؤں کی چھوٹی سی مسجد سے فجر کی نماز پڑھ کر نکلنے ہی والے تھے کہ پاس ہی کچھ عورتوں کے رونے بلکنے کی آوازوں نے' پرندوں کی آوازوں کے بیچ'

خوبصورت ماحول میں ایک ارتعاش سا پیدا کر دیا۔ رونے اور ماتم کرنے کی آوازیں للّ دید کی کٹیا سے ہی آرہی تھیں۔ ہمارے قدم خود بخود اسی کٹیا کی طرف مڑ گئے وہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ للّ دید اب ہمارے بیچ نہیں رہی۔ مالک حقیقی سے جا ملی ہے۔ روتی، سینہ کوبی کرتی ہوئی رخسانہ بتا رہی تھی کہ کل شام جب وہ کھانا دینے آئی تو دید شدید بخار سے تپ رہی تھی۔ بھاگتی دوڑتی اس نے گاؤں کی ڈسپنسری سے دوائی لا کر کھلائی تھی اور گھر میں بھی کہہ آئی تھی کہ وہ رات دید کے ہاں ہی گزار دے گی۔ نصف شب کے بعد جب اس کی حالت زیادہ خراب ہوگئی تو اس نے پاس پڑوس کی اور ایک دو خواتین کو بلا کر لایا تھا۔ صبح صادق جب مرغے نے پہلی بانگ دے دی تو دید۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟ اس کے بعد وہ اپنی رندھی ہوئی آواز کو جاری نہ رکھ سکی۔

پورا گاؤں سوگوار تھا۔ سب لوگ جمع تھے کہ اب کریں تو کیا کریں؟ لللیشوری کا دور دور تک نہ یہاں اور نہ یہاں سے باہر کوئی رشتہ دار یا سگا سمبندھی تھا۔ کوئی متفقہ رائے نہیں بن پا رہی تھی کہ اس جسد خاکی کا آخر کیا کیا جائے؟ اور پھر یہاں کوئی موجود بھی نہیں تھا جو ہندو ریتی رواج کے مطابق دہ سنسکار یا کریا کرم کرتا۔

کسی جانب سے آواز ابھری "بھائی دید جن لوگوں سے جڑی ہوئی تھی وہ ہی اسے چھوڑ کر چلے گئے۔ کسی میں ہمت نہ ہوئی اسے اپنے ساتھ لے جانے کی؟ کسی نے مڑ کر بھی نہیں دیکھا؟ کیا کر رہی ہے؟ کیا کھا رہی ہے؟" دوسری جانب سے اور ایک آواز بلند ہوگئی "سب لوگ اپنے اپنے افرادِ خانہ کے ساتھ چلے گئے للّ کسی کی تھی ہی نہیں اسے کون اپنے ساتھ لے جاتا؟"

پاس والے کونے سے ایک بزرگ اپنی نحیف و کمزور اور روہانسی آواز میں بول اٹھے "بیٹے ایسا مت کہو؟ للّ ہماری ہے اور ہم اس کے ہیں؟ یہ میرے بھائی سورگباشی مادھو رام کی بیٹی ہے جسے میں نے مرتے وقت وعدہ دیا تھا کہ للّ میری بیٹی

آج تک معمہ بنی ہوئی ہے۔

لل دید جوں کی توں اپنی کٹیا میں بلا کسی تغیر و تبدل کے اطمنان وسکون کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ نہ صمد چاچا کے ہاں کھانے پینے سے اس کا دھرم برشٹ کرانے والے پنڈت لچھمن جو ہی اسے اپنے ساتھ لے گئے اور نہ ہی دوسرے پانچ سات اس کی ذات برادری والے گھرانوں میں سے ہی کسی فرد نے یہ زحمت گوارہ کی؟۔

آج سے مکمل طور پر لل دید اس گاؤں کی اور اس گاؤں میں صدیوں سے بود وباش اختیار کرنے والے اکثریتی فرقے کی میراث اور ان کی مکمل ذمہ داری بن گئی کہ گاؤں کے جس شخص سے جو کچھ بن پڑتا تھا۔ وہ اس کے لئے کرتا تھا۔ کسی کے ذمہ صبح کے ناشتے میں مکی کی روٹی اور نمکین چائے پلانا تھا تو کسی کے ذمہ دوپہر میں لسی اور ساگ سبزی کے ساتھ ابلے ہوئے چاول کھلانا تھا۔ کسی کے ذمہ سہ پہر کو ستو اور قہوہ پلانا تھا تو کسی کے ذمہ رات کا کھانا کھلانا۔ حاجرہ چاچی ہفتے میں ایک دوبار اسے نہلاتی اور دھلے ہوئے کپڑے پہناتی تھی تو فاطمہ تائی اس کے بالوں کو سنبھالتی سنوارتی تھی۔ کبھی بیمار پڑتی تھی تو دس خیر وعافیت پوچھنے والے لوگوں کا کٹیا میں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ اور وقت وقت پر دوائی کھلانے کی ذمہ داری بانٹ دی جاتی تھی۔

چونکہ سارا گاؤں مسلمانوں کا تھا اسلئے عیدین اور شادی بیاہوں پر طرح طرح کے پکوان لل دید کے لئے آجاتے تھے۔ دید بھی سب کا دل رکھنے کے لئے ضرور ان کا مزا چکھ ہی لیتی تھی اور دوسروں کے اصرار پر پیٹ بھر کر کھا بھی لیتی تھی کہ آج اس کا دھرم برشٹ کرنے والا پنڈت لچھمن جو گاؤں میں موجود بھی نہیں تھا۔

دن گزرتے رہے۔ لمحے، گھڑیاں، دن، ہفتے، مہینے اور سال۔۔۔۔۔۔۔؟' ایک دن ہم صبح سویرے گاؤں کی چھوٹی سی مسجد سے فجر کی نماز پڑھ کر نکلنے ہی والے تھے کہ پاس ہی کچھ عورتوں کے رونے بلکنے کی آوازوں نے، پرندوں کی آوازوں کے بیچ،

خوبصورت ماحول میں ایک ارتعاش سا پیدا کر دیا۔ رونے اور ماتم کرنے کی آوازیں للّی دید کی کٹیا سے ہی آرہی تھیں۔ ہمارے قدم خود بخود اسی کٹیا کی طرف مڑ گئے وہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ للّی دید اب ہمارے بیچ نہیں رہی۔ مالک حقیقی سے جا ملی ہے۔ روتی، سینہ کوبی کرتی ہوئی رخسانہ بتا رہی تھی کہ کل شام جب وہ کھانا دینے آئی تو دید شدید بخار سے تپ رہی تھی۔ بھاگتی دوڑتی اس نے گاؤں کی ڈسپنسری سے دوائی لاکر کھلائی تھی اور گھر میں بھی کہہ آئی تھی کہ وہ رات دید کے ہاں ہی گزار دے گی۔ نصف شب کے بعد جب اس کی حالت زیادہ خراب ہوگئی تو اس نے پاس پڑوس کی اور ایک دو خواتین کو بلا کر لایا تھا۔ صبح صادق جب مرغے نے پہلی بانگ دے دی تو دید۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟ اس کے بعد وہ اپنی رندھی ہوئی آواز کو جاری نہ رکھ سکی۔

پورا گاؤں سوگوار تھا۔ سب لوگ جمع تھے کہ اب کریں تو کیا کریں؟ للّیشوری کا دور دور تک نہ یہاں اور نہ یہاں سے باہر کوئی رشتہ دار یا سگا سمبندھی تھا۔ کوئی متفقہ رائے نہیں بن پا رہی تھی کہ اس جسد خاکی کا آخر کیا کیا جائے؟ اور پھر یہاں کوئی موجود بھی نہیں تھا جو ہندو ریتی رواج کے مطابق دہ سنسکار یا کریا کرم کرتا۔

کسی جانب سے آواز ابھری "بھائی دید جن لوگوں سے جڑی ہوئی تھی وہ ہی اسے چھوڑ کر چلے گئے۔ کسی میں ہمت نہ ہوئی اسے اپنے ساتھ لے جانے کی؟ کسی نے مڑ کر بھی نہیں دیکھا؟ کیا کر رہی ہے؟ کیا کھا رہی ہے؟" دوسری جانب سے اور ایک آواز بلند ہوگئی "سب لوگ اپنے اپنے افرادِ خانہ کے ساتھ چلے گئے للّی کسی کی تھی ہی نہیں اسے کون اپنے ساتھ لے جاتا؟"

پاس والے کونے سے ایک بزرگ اپنی نحیف و کمزور اور روہانسی آواز میں بول اٹھے "بیٹے ایسا مت کہو؟ للّی ہماری ہے اور ہم اس کے ہیں؟ یہ میرے بھائی سورگباشی مادھو رام کی بیٹی ہے جسے میں نے، مرتے وقت وعدہ دیا تھا کہ للّی میری بیٹی

ہے؟ بالکل میری زبیدہ جیسی ہی!"

کہیں سے اور ایک آواز بلند ہوئی "چاچا اس میں کیا شک ہے؟ کیا ہم نے اپنی سگی بیٹی اور بہن کی طرح ہی اتنے برسوں سے اس کی پرورش نہیں کی؟ اور ہر طرح سے اس کا خیال نہیں رکھا؟ ہم نے کب اسے خود سے جدا سمجھا؟ اور یہ بھی تو ہمارے ہی جسم و روح کا ایک حصہ تھی؟ ایک ناقابل تنسیخ حصہ؟۔"

اس آواز کی تائید میں کئی دیگر آوازیں بھی مل گئیں۔

اسی اثناء میں مسجد کے بزرگ اور عمر رسیدہ امام صاحب لاٹھی ٹیکتے ہوئے قدم بہ قدم چل کر آتے ہوئے دکھائی دیے۔ تعظیماً سب لوگ خاموش ہو گئے ان کے لئے جگہ خالی کی گئی۔ ذرا دیر بیٹھتے ہی، ان کی سانسوں کا ارتعاش تھم گیا۔ شاید صمد چاچا بھی اسی کے انتظار میں تھے کہ فوراً ہی نرم لہجے میں انتہائی عاجزی اور انکساری کے ساتھ روہانسے لہجے میں پوچھنے لگے۔ "امام صاحب۔۔۔؟ آپ ہمارے بزرگ ہیں اور محترم بھی، اور پھر سورگباشی مادھو رام کے ساتھ آپ کے تعلقات۔۔۔۔۔۔۔؟ ان کی بیٹی للیشوری کی میت ان کی کٹیا میں پڑی ہوئی ہے؟ سب لوگ تذبذب میں ہیں کہ کیا کیا جائے۔ آپ کا دانشمندانہ فیصلہ یقیناً حق بجانب ہوگا؟ آپ جو فیصلہ فرمائینگے؟ سب کے لئے قابلِ قبول بھی ہوگا۔ آپ اس گاؤں کی عزت۔ جو ٹھرے۔۔۔۔۔۔۔؟ ابھی وہ اپنی بات ختم نہ کر پائے تھے کہ وہاں موجود سب لوگوں نے ایک آواز میں اس کی تائید کر دی۔

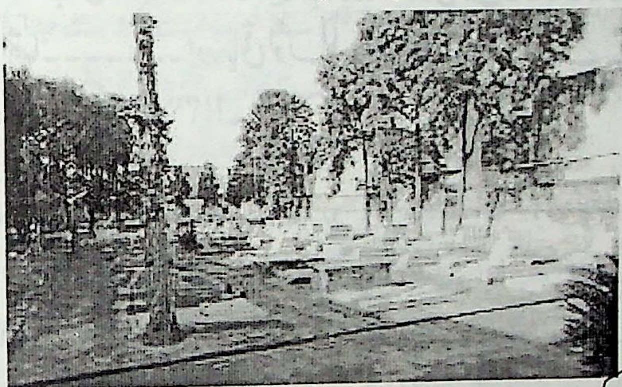
امام صاحب جیسے کسی گہری سوچ میں پڑ گئے۔ کچھ دیر توقف کے بعد، دھیمی آواز میں ان کا فیصلہ یوں آیا جو وہاں موجود سب لوگوں نے انتہائی اشتیاق، توجہ اور خاموشی کے ساتھ سنا۔ جو بالکل صاف سنائی دے رہا تھا۔ امام صاحب فرما رہے تھے "للیشوری کو۔۔۔، اس کے سورگباشی باپ۔۔۔۔۔، مادھو رام نے، ۔۔۔۔۔ اپنے پران تیاگتے وقت، ہمیں۔۔۔۔، اس گاؤں کو۔۔۔۔۔، سونپا تھا اور وہ لل عارفہ بن کر ہم

میں گھل مل گئی اور اختتام کو بھی پہنچ گئی''بس اتنا کہتے ہی امام صاحب خاموش ہو گئے۔
میں قریب ہی ------' مٹی کے ایک چھوٹے سے ٹیلے پر
-------'امام صاحب کی -------'سیلاب زدہ آنکھوں میں -------' پتہ نہیں؟
کیا تلاش کرر ہا تھا-------اور باقی لوگ لل عارفہ کی میت' اٹھانے کے لئے اس
کی کٹیا کی طرف جانے لگے تھے؟؟!!۔





اپنا اپنا دکھ درد



لڑکپن میں، میں نے اپنے والدِ مرحوم کو بھی ایسا ہی کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی میرا ابھی یہی معمول بن چکا ہے کہ شب قدر اور عیدین پر، مسجد میں نمازِ فجر پڑھ کر ہی فوراً فاتحہ خوانی کے لئے اپنے آبائی مقبرے پر جایا کرتا ہوں۔

عرفہ کی شام کو چاولوں یا مکی سے بھرا ہوا پالتھین کا لفافہ میرے بیڈ روم میں رکھوا دیا جاتا ہے تا کہ صبحِ صادق نمازِ فجر کی ادائیگی کو جاتے وقت میں اسے اپنے ساتھ ہی اٹھا کر لے جاؤں اور مقبرے پر اپنے آباؤ اجداد کی قبروں پر، اسطرح سے پھیلاؤں کہ صبح ہوتے ہی پاس پڑوس کے بھوکے کبوتر، کوے، چڑیاں، بلبل وغیرہ آ کر ان چاولوں کو کھائیں اور اسطرح سے سالہا سال سے ان قبروں میں سونے والے ہمارے آباؤ اجداد کو اس کا بھر پور صلہ، جزائے خیر اور ثواب مل سکے۔

اس سے پہلے کہ میں آگے بڑھوں، آپ کو اپنا مختصر سا تعارف کرائے دیتا ہوں؟ آپ ضرور مجھے جانتے ہونگے؟ میں اس شہر کے ایک مشہور و معروف شخص مرحوم چاپری صاحب، جو اپنی سادگی، شرافتِ نفس، خدا ترسی اور قائدانہ صلاحیتوں کی وجہ سے دور دور تک جانے جاتے تھے، کا اکلوتا فرزند، اقبال چاپری ہوں۔

چھ سال قبل ۲۳ ر دسمبر کی رات کو نصف شب کے وقت، والدہ نے مجھے
نیند سے جگا دیا اور والد صاحب کی اچانک شدید علالت کی خبر دی۔ ذہنی افراتفری کی
حالت میں، جونہی میں ان کے کمرے میں پہنچا تو وہ ہمیشہ کے لئے رختِ سفر باندھنے کی
جلدی میں تھے۔ میری پریشانی بھانپتے ہوئے، مجھے علاج و معالجے اور ڈاکٹروں کو
بلانے کی تگ ودو سے روکتے ہوئے، اپنے سرہانے بیٹھنے کے لئے اشارہ کرتے ہوئے،
اپنی دھیمی اور نحیف آواز میں، یوں مخاطب ہوئے۔
"بیٹے! مجھے پتہ نہیں کہ یہاں کے موجودہ انتہائی ابتر حالات کونسی
کروٹ لینگے؟ نہ اپنے دیرینہ تجربے اور مشاہدے کی بدولت یہ کہہ سکتا ہوں یا اندازہ لگا
سکتا ہوں کہ کب کیا ہونے والا ہے؟ یہاں کے حالات انتہائی حساس اور غیر یقینی قسم کے
ہیں۔ لیکن مجھے امید ہے کہ جوں توں کر کے یہ سیاہ بادل چھٹ جائینگے اور دور افق کی بلندی
سے پھوٹتی ہوئی نور کی کرنوں کے ساتھ ہی، صبحِ نو طلوع ہو جائیگی۔ وہ نئی صبح؟ جس کے
انتظار میں ہماری کئی پیڑیاں گذر گئیں۔ میرے جیسے لاتعداد لوگ بھی اسی طرح گذر
گئے۔ جسطرح میں گذرنے والا ہوں۔ نہ جانے مجھے کیوں یہ یقین سا ہو گیا ہے کہ بہت
جلد یہ سب کچھ بدلنے والا ہے اور ایک نئی صبحِ طلوع ہونے ہی والی ہے، ہاں۔۔۔ بہت
جلد۔۔۔ طلوع ہونے والی ہے اور تمہارے ہوتے ہوئے طلوع ہونے والی ہے۔
افسوس میں اسے نہیں دیکھ پاؤں گا؟ میں تم سے ایک وعدہ لینا چاہتا
ہوں، تمہیں بس اتنا کرنا ہوگا کہ میری قبر پر آ کر مجھے مطلع کرنا ہوگا، مجھے بتانا ہوگا؟ کہ واقعی
وہ صبحِ نو طلوع ہو گئی۔ جس کا ہمیں ایک عرصہ
سے انتظار ہے۔ جس کے انتظار میں ہماری کئی پیڑیاں گزر گئیں۔"
اچانک والد صاحب کی آواز مدھم ہوتے ہوئے بالکل رک گئی انتہائی
گھبراہٹ میں میری آنکھیں ان کے چہرے پر ٹک گئیں اور دائیاں ہاتھ ان کے سر پر چلا

گیا۔ جو پسینے سے تر بتر تھا۔ ان کی دونوں آنکھیں وا تو تھیں لیکن ان کا نو
جیسے۔۔۔۔۔۔۔۔۔اڑ گیا تھا۔ پرواز کر گیا تھا' انجان مصافتوں کی
جانب۔۔۔ جہاں سے وہ واپس نہیں لوٹتا ہے۔!

والد صاحب کے انتقال کو کئی سال ہو چکے ہیں اور وہ نئی ز
ہنوز۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟؟

حسب معمول شب برات اور عیدین پر میں ان کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لئے
جاتے ہوئے نہ جانے کیوں انتہائی شرمندگی اور خجالت سی محسوس کرنے لگا؟ کہ کئی سال
گذر جانے کے باوجود بھی۔۔۔۔۔۔ میں ان سے کیا ہوا اپنا وعدہ نبھا نہ سکا' پورا نہ کر
سکا؟ اور شاید مستقبلِ قریب میں بھی۔۔۔۔۔۔۔۔؟

بالآخر میں نے روز روز کی شرمندگی اور خجالت کے باعث اپنے
خاندان میں' پشت در پشت چلی آرہی' اس روایت کو توڑ دیا اور اس بار میں نے نہ شب
برات اور نہ عیدین پر ہی مقبرے کا رخ کیا۔۔۔۔؟

مجھے انتہائی کوفت ہو رہی تھی کہ میں نے' نہ جانے کب سے
ہمارے خاندان میں چلی آرہی' اس روایت کو توڑا؟۔ دوسری طرف میری والدہ کو بھی
بہت برا محسوس ہو رہا تھا گو وہ اس کا اظہار نہیں کر پا رہی تھی۔ حالانکہ کئی بار دبے الفاظ میں
وہ اپنی شکایت درج کرا چکی تھی اور مجھ سے استفسار بھی۔ جسے میں کمال مہارت سے ٹال بھی
گیا تھا۔

عید آنے والی تھی۔ میں نے عرفہ کی شام کو چاولوں سے بھرا ہو
پالتھین کا لفافہ اپنے کمرے میں رکھوا دیا تا کہ اسے اپنے ساتھ کل لے جاسکوں اور مسجد سے
نمازِ فجر سے فارغ ہو کر ہی' اپنے آبائی مقبرے پر فاتح خوانی کرنے کے بعد' پرندوں کے
لئے پھیلا دوں۔

نمازِ فجر سے فارغ ہو کر میرے قدم خود بخود مقبرے کی جانب بڑھنے لگے۔ ابھی مقبرے میں میرے سوا اور کوئی داخل نہیں ہوا تھا۔

فاتحہ خوانی کے بعد چاولوں سے بھرے لفافے کو خالی کر کے' میں والدِ محترم کی قبر کے قریب جا کر یوں بلند آواز میں گویا ہوا؟

''چیچینیا کے نوے سالہ ریٹائرڈ اسکول ٹیچر' سلیمان گرانوف' روسی فوج کے محاصرے کے دوران ساری رات' اپنے شہر کی گلیوں کوچوں میں ننگے پاؤں گھومتے رہے ور چیخ چیخ کر یہ صدائیں بلند کرتے رہے کہ شہر کے لوگو! خبردار' روسی فوج کے سامنے ہتھیار مت ڈالنا؟ فتح اور شکست کے فیصلے آسمانوں پر ہوتے ہیں۔ ہمت مت ہارنا اور اپنی جگہوں پر چٹان کی طرح ڈٹے رہنا۔ میری بات کو' ایک بوڑھے اور ضعیف العمر شخص کی اختراع سمجھ کر ٹالنا مت؟ یہ سب باتیں اس کے ماتھے پر پڑیں تجربے اور مشاہدے کی جھریاں اور خدائے وحدہ لاشریک پر اس کا کامل بھروسہ اس سے کہلوا رہی ہیں؟؟!!''

سلیمان گرانوف کی درد بھری آواز اور اس کے بے لوث جذبے میں وہ اثر تھا کہ کسی بھی شخص نے ہتھیار نہیں ڈالے اور مقابلے میں تب تک ڈٹے رہے جب تک نہ روسیوں پر مکمل فتح پالی اور پسپائی ان کا مقدر بنا کر انہیں بھگا دیا؟''

ہلکی ہلکی روشنی ہونے لگی تھی۔ میں جب مقبرے سے باہر آ گیا تو دیگر لوگ داخل ہونے لگے تھے۔ میں ایک عجیب اطمنان وسکون کے ساتھ گھر پہنچ گیا والدِ محترم کے انتقال کے بعد' میں پہلی بار مقبرے سے لوٹ کر ہلکا ہلکا سا محسوس کر رہا تھا جیسے میرے سینے کا سارا بوجھ اتر گیا ہو۔ جس کے ناقابل برداشت وزن سے' میری کمر روز بروز جھکی جا رہی تھی اور میرے قدم زمین میں دھنسے جا رہے تھے۔ والدہ بھی مطمئن نظر آ رہی تھی کہ میں نے پھر سے اپنی خاندانی پرمپرا۔۔۔۔۔۔۔۔؟؟

نمازِ فجر سے لوٹنے کے بعد مسجد سے آ کر ایک ڈیڑھ گھنٹہ دوبارہ سونے کی میری

پرانی عادت رہی ہے۔ آنکھ لگتے ہی کیا دیکھتا ہوں کہ چاپری صاحب سر جھکائے، آنکھیں نیچے کئے ہوئے، انتہائی شرمندگی اور ندامت کے ساتھ، جیسے میرے سامنے کھڑے ہیں اور، بار بار دھرا رہے ہیں۔ "۔۔۔۔۔کاش ہم میں بھی کوئی سلیمان گرانوف۔۔ پیدا ہوا ہو گیا ہوتا؟؟' ۔۔۔۔۔۔کاش۔۔۔۔ہم۔۔۔۔میں۔۔۔۔بھی۔۔۔۔۔کوئی۔۔۔ سلیمان۔۔۔گرانوف۔۔۔۔پیدا۔۔۔ہوا۔۔۔۔ ہو گیا ہوتا؟؟؟۔ کاش۔۔۔۔۔۔۔ہم۔۔۔۔بھی۔۔۔۔۔کوئی۔۔۔۔۔۔۔؟؟!!"

"بیٹے! اقبال۔۔۔۔۔۔' احمد اللہ صاحب آئے ہیں؟۔ آپ کو پوچھ رہے ہیں؟ کیا جواب دوں؟" والدہ کی اس آواز کے ساتھ دروازے پر دستک نے مجھے جگا دیا۔ میں نے اپنے اوپر پڑے ہوئے چادر کو ہٹاتے ہوئے، سہمے ہوئے انداز میں اپنے آپ کا بھرپور جائزہ لیا۔ میرا روم روم پسینے سے شرابور تھا۔ اپنے بے پناہ عزم و استقلال اور صبر و بردباری میں، اپنے پاس پڑوس اور اپنے قبیلے میں مشہور، چاپری صاحب کو میں نے زندگی میں پہلے بار اسقدر مجبور ولاچار اور نادم و بے بس پایا تھا۔

اپنے مرحوم والد محترم کے دیرینہ دوست، قبلہ احمد اللہ صاحب سے گلے ملکر میرے سینے کا بوجھ کافی ہلکا ہو گیا۔ ان کے منہ سے ڈھیر ساری دعائیں سن کر، نہ جانے مجھے ایسا کیوں محسوس ہوا؟ کہ یہ دعائیں جیسے مرحوم چاپری صاحب کے منہ سے ہی نکل رہی ہیں؟۔ جن کا میں بیٹا ہوں ۔۔۔۔۔ہاں میں اقبال چاپری۔۔۔۔؟!!! احمد اللہ صاحب بتا رہے تھے کہ انہوں نے والد صاحب کو آج خواب میں انتہائی غیر متوقع حالت میں دیکھا تھا اسی لئے خیریت پوچھنے آئے تھے۔



قدسیہ آپا

میں اس نئے گھر میں نئی نئی ہی آئی ہوں یہاں اتنے سارے لوگ رہ رہے ہیں اور لگ بھگ سبھی لوگ پچاس سال سے زیادہ عمر کے ہیں۔ دراصل یہ ایک اولڈ ایج ہوم ہے جہاں اپنے بچے اور دیگر رشتہ دار اپنے بزرگ والدین اور عزیز و اقارب کو چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ اولڈ ایج ہومز بھی ہمارے معاشرے میں بہت زیادہ متمدن اور ترقی یافتہ یورپی اقوام کی دین ہیں ورنہ بیس تیس سال قبل ہمارے ہاں ان اولڈ ایج ہومز کی کوئی روایت یا وجود نہیں تھا۔ بزرگوں کو گھر کی زیب و زینت سمجھا جاتا تھا اور ان کی اطاعت و فرمانبرداری کو باعثِ خیر و برکت تصور کیا جاتا تھا۔ زندگی کتنی بدل گئی ہے اس کے طور طریقے اور اقدار و انداز بھی بہت بدل گئے ہیں آج انہی عمر رسیدہ بزرگوں کو ایک عضوئے معطل سمجھکر ان اولڈ ایج ہومز میں مرنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے اور ان کی خیر و عافیت تک دریافت کرنا گوارہ نہیں کیا جاتا ہے اور اسے اوٹ آف فیشن سمجھا جاتا ہے۔ جن بزرگوں نے عمر بھر کی کمائی اور پونجی، اولاد کی تعلیم و تربیت اور پرورش پر خرچ کی

ہوتی ہے۔وہی بزرگ اپنے گھر بار اپنی فیملی اور اپنے عزیز و اقارب سے الگ اور جدا کردئے جاتے ہیں یہی آج کی اس بدلتی دنیا کا دستور بن چکا ہے۔

شہر کے ہنگاموں سے دور اس اولڈ ایج ہوم میں مجھے اب ایک ہفتہ ہونے کو ہے۔میں یہاں دیگر معمر و معزز خواتین کی طرح لائی نہیں گئی ہوں بلکہ خود آئی ہوں۔یہاں جتنی بزرگ خواتین اس وقت موجود ہیں ہر ایک کی اپنی اپنی اور منفرد و مخصوص رام کہانی ہے۔کچھ ہر آنے جانے والے شخص کو سناتی بھی ہیں اور کچھ اس سمندر کی طرح ہی خاموش ہیں جس میں لاتعداد طوفان چھپے ہوئے ہوتے ہیں لیکن ایک بات جو یہاں رہ رہے ہر فرد میں مشترک ہے وہ یہ ہے کہ ان سب کی کہانیاں انتہائی ٹریجک اور رلا دینے والی ہیں کہ سننے والا اگر میری طرح ہی حساس ہو تو اس کی آنکھوں سے-------------------------؟؟!!-

کچھ سمجھ میں ہی نہیں آرہا ہے کہ میں کہاں سے شروع کروں اور کیسے شروع کروں "Chairty begins at home" کے مقولے کے تحت میں خود سے ہی شروع کرتی ہوں اس لئے بھی کہ میری کہانی ان سب معمر خواتین سے بالکل منفرد و مختلف ہے۔

میں یہاں کے مقامی میڈیکل انسٹچوٹ کے نرسنگ شعبے سے وابستہ تھی۔ابھی حال ہی میں پنشن کو پہنچنے تک بیماروں کی خوب تیمارداری کرتی رہی۔کئی ایوارڈ بھی جیت لئے،میری مصروفیات اور منصب و پیشے نے مجھے کبھی فرصت ہی نہ دی کہ میں اس سے ہٹ کر کچھ اور سوچوں۔والدین کی اکلوتی اولاد تھی،شادی اپنے ہی رشتے میں ہوگئی۔تین بیٹیاں ہوئیں۔جنہیں اچھی طرح سے پالا پوسا اور شادی بھی کردی جو اپنے اپنے گھروں میں خوش ہیں اور میں---------؟اتنے بڑے گھر میں اکیلے رہ گئی۔

صبر و استقلال رگوں میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا شاید اسی لئے بنانے والے نے نرسنگ کے پیشے کے لئے منتخب کرلیا۔گھر کے لوگوں کے علاوہ پاس پڑوس کے لوگ بھی،

شاید اسی لئے ناظرہ کے بجائے صابرہ آپا کہہ کر پکارتے تھے۔ شوہر بھی اپنے جیسے ہی ملے تھے میری بد قسمتی کہ زیادہ دیر ان کی قربت میسر نہ رہی اور ان کی قربت سے محروم ہوگئی۔ ان کا اسطرح سے بچھڑ جانا کافی صبر آزما تھا۔ یہاں بھی اگر کوئی کام آیا تو وہ بھی میرا صبر ہی تھا۔

شوہر سے پہلے والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ تین بیٹیاں، حمیرہ، سعدیہ اور راحلہ ہی میرے لئے سب کچھ بن گئیں۔ ان کی اچھی تعلیم و تربیت کے بعد شادیاں بھی ہوگئیں اور وہ اپنے گھر سنسار میں خوش ہیں۔ اچھی خاصی پنشن مل رہی ہے جو میرے اخراجات و ضروریات سے زیادہ ہے۔

بیٹیوں کی شادی اور ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے وسیع و عریض گھر میں اکیلے بیٹھے بیٹھے بہت کوفت محسوس ہو رہی تھی۔ روز نئے نئے بیماروں سے ملنے ملانے اور ان کا دکھ درد بانٹنے، ان کی خدمت و تیمارداری کی، کئی دہائیوں کی عادت اور روزمرہ کے معمول نے بیکار بیٹھنے نہ دیا اور ایک دن اس اولڈ ایج ہوم میں آنے اور پھر اپنے کام میں جٹ جانے کا من بنا لیا۔ ہاں اس بار یہ کام بغیر معاوضہ کر رہی ہوں اور پنشن سے بچنے والی رقم بھی یہیں خرچ کرنے کا ارادہ ہے۔ رہنے کے لئے ایک چھوٹا سا کمرہ بھی مل گیا ہے جس میں گذر بسر کر رہی ہوں اور مطمئن بھی ہوں۔

یہاں اس اولڈ ایج ہوم میں رہ رہے ایک ایک فرد کی روداد سن کر میں صابرہ ہی کیا پتھر اور کنکر بھی رونے اور سسکنے لگتے ہیں۔ قدسیہ آپا سب سے زیادہ بولتی ہیں اس کا بڑا بیٹا دانش انجینئرنگ مکمل کر کے سعودی عرب چلا گیا تھا جب اس کے والد ابھی زندہ ہی تھے۔ پھر وہیں کسی پاکستانی لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ والد کے انتقال پر دونوں میاں بیوی اپنے دونوں بچوں کے ساتھ کچھ دنوں کے لئے آئے بھی تھے پھر اس کے بعد جیسے رابطہ ہی منقطع ہو گیا۔ کہاں ہیں؟ کیسے ہیں؟ اور کیا کر رہے ہیں بہت دنوں سے اسے کوئی

انہ پتہ ہی نہیں ہے۔ چھوٹا بیٹا سرور دوبئی کے ایک ہوٹل میں منیجر ہے بیچ بیچ میں یہاں آنے والے کسی مقامی شخص کے ہاتھوں پیسے اور کپڑے وغیرہ بھی بجھوادیا کرتا تھا لیکن کافی دنوں سے اس کی بھی کوئی خبر یا خیریت نہیں مل رہی ہے لگ بھگ دو سال قبل ایک شخص آبائی گھر کو مقفل دیکھکر، پڑوسیوں سے معلوم کر کے اس اولڈ ہوم میں آیا تھا اور پیسے بھی لایا تھا لیکن قدسیہ آپا نے یہ کہکر لوٹا دئے تھے کہ میرے پاس فیملی پنشن کی رقم پڑی ہوئی ہے مجھے پیسے نہیں میرا بیٹا چاہئے؟۔تب سے پھر کوئی آیا ہی نہیں۔

حمیدہ چاچی لگ بھگ اسی سال کی ہے۔اس کا اکلوتا بیٹا اصغر نیوی میں چلا گیا تھا اچھے عہدے پر فائز ہو گیا تھا۔حمیدہ چاچی کہہ رہی ہے کہ شادی بھی ہو گئی تھی اور بچے بھی ہو گئے ہونگے۔حاجی صاحب ایک غریب گھرانے سے تھے۔جو کچھ خون پسینے کی کمائی سے پیٹ کاٹ کاٹ کر کما لیتے تھے بیٹے کی ٹریننگ پر خرچ کرتے تھے۔حمیدہ چاچی کو جو دو چار سونے کے زیورات شادی پر مل گئے تھے وہ تک اس نے، بیٹے کی خوشی کے لئے بیچ ڈالے تھے۔حاجی صاحب کے انتقال کے بعد حمیدہ چاچی کا کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔پھر کسی نے یہاں لاکر چھوڑ دیا۔اب کئی برسوں سے یہیں پر اپنے اکلوتے بیٹے کے انتظار میں رہ رہی ہے اور اکثر بیمار بھی رہنے لگی ہے۔

حاجرہ بی بی کے چھ بیٹے تھے ہاں ہاں نصف درجن بیٹے۔۔۔۔؟!' سب لوگ اسے بات بات پر کہتے تھے کہ یہ چھ بیٹوں کی اماں ہے اسے کیا پریشانی یا غم ہے؟ دن گزرتے رہے زندگی بھر جو جائیداد پائی پائی جٹا کر جمع کر رکھی تھی اس کی تقسیم پر بھائیوں میں اسطرح ٹھن گئی کہ کورٹ کچہری تک پہنچ گئے۔بھائی بھائی کا جانی دشمن بن گیا اور اماں بیچاری نہ ادھر کی اور نہ ادھر کی رہی اور بالآخر اس اولڈ ہوم میں پہنچ گئی۔

اسی طرح ریحانہ باجی، منیرہ خاتون، فرزانہ اماں، طاہرہ دیدی اور دوسروں کے منفرد و مخصوص قصے اور کہانیاں ہیں۔ الگ الگ رام کہانی ہے رودادِ غم یا داستان

ہے۔ کس کس کی سنئیے گا؟ اور کس کس کی روداد ِ غم پر آنسو بہائیے گا؟

ان سب کی بوڑھی اور کمزور بینائی والی آنکھوں میں کتنا پانی ہے، جسے یہ ایک عرصہ سے بے تحاشا بہار ہی ہیں اور بہائی جا رہی ہیں۔ جو سمندر کی پانی کی طرح کبھی خشک نہیں ہو جاتا اور نہ ہی اس کے نمکین اور کھارے پانی کے ذائقے میں کوئی کمی آجاتی ہے؟۔ یہ تب تک روتی رہتی ہیں جب تک یہ اس اولڈ ہوم میں زندہ رہتی ہیں اور جب یہ زندگی کا جنگ ہار جاتی ہیں تب یہ مکمل طور پر خاموش ہو جاتی ہیں اور ان کے بزرگ وبد برجھریوں سے پُر چہرے مسلسل اور متواتر نمکین آنسوں سے دھو دھو کر صاف وشفاف اور اجلے اور نورانی چہرے بن جاتے ہیں۔ پھر عمر بھر اپنے بیٹوں کو ایک بار دیکھنے کی خواہش وآس بھی دم توڑ تی ہے اور پایہ تکمیل تک نہ پہنچنی والی اس امید سے بھی انہیں نجات مل جاتی ہے ان کی عمر بھر کی بیقراری کو قرار مل جاتا ہے اور ان کے چہرے پرسکون مطمئن دکھائی دیتے ہیں۔

ان سب میں ایک قدرِ مشترک یہ ہے کہ انہیں مظبوط ومستحکم امید رہتی ہے کہ ان کا بیٹا یا بیٹے انہیں ضرور دیکھنے آئینگے اور انہیں اپنے ساتھ لے بھی جائینگے۔ تعجب ہے یہاں ایک دولا ولد خواتین کو بھی ایسا کہتے ہوئے سنا گیا ہے۔ پرسوں جو خورشیدن تائی انتقال کر گئی وہ کئی دن سے حالتِ نزاع میں تھی پھر کسی بزرگ خاتون نے اسے دیکھ کر باتوں باتوں میں بتا دیا تھا کہ بیٹے کے انتظار میں پران نہیں تیاگ رہی ہے فوراً اس کے ساتھ والی آمنہ بوا نے اس کے صندوق سے اس کے بیٹے کا فوٹو لا کر اسے دکھا دیا تھا۔ جیسے واقعی بیٹے کا ہی انتظار کر رہی تھی۔فوٹو دکھا نا کیا تھا کہ۔-----------؟؟!!۔

اسی طرح یہاں جتنے لوگ ہیں ان کی اتنی ہی کہانیاں ہیں۔ کچھ تو پھر بھی جوں توں کر کے سناتے ہی رہتے ہیں لیکن کچھ بالکل خاموش ہیں جیسے ان کے ساتھ کچھ ہوا ہی نہ ہو یا پھر اپنے خون کی بے رخی اور لاتعلقی نے جیسے مکمل طور پر انہیں بہرا اور گونگا بنا دیا

ہو یا پھر ان کے اذہان کو مکمل طور پر مفلوج و شل بنادیا ہو۔

صرف قدسیہ آپا بولتی ہے اور بولتی ہی رہتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں تک کا خیال رکھتی ہے اور سب کا' جہاں تک ممکن ہو سکے خیال بھی رکھتی ہے۔ ان کے مرحوم شوہر خان صاحب پولیس میں ایک اچھے عہدے پر رہ چکے تھے۔ فیملی پنشن کی بچی ہوئی رقم اولڈ ہوم کو دیتی ہے اور اس عمر میں بھی کافی فعال اور مستعد دکھائی دیتی ہے۔ میری بھی قدسیہ آپا سے خوب نبھتی ہے۔ میرے کمرے میں بھی آتی ہے اور خوب باتیں ہوتی ہیں بہت مخلص اور مشفق خاتون ہے۔ سینے میں ایک ہمدرد دل رکھتی ہے اور ہر ایک مصیبت زدہ اور لاچار، بے کس و بے بس شخص کے کام آنا اپنا مقصد و منصب سمجھتی ہے اسلئے سب کی خبر رکھتی ہے۔ اکثر میں بھی قدسیہ آپا کے ساتھ اپنے نجی مسائل شئر کرنے میں کسی قسم کی کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتی ہوں۔ جیسے وہ مجھ سے کسی قسم کی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتی۔ کل ہی مجھ سے میری تین بیٹیوں کے بارے میں تفصیل کے ساتھ دریافت کر رہی تھی۔ میرے منہ سے ان کی تعریفیں سن کر بہت خوش ہو گئی اور ان سے ملنے اور انہیں دیکھنے کی خواہش بھی کرنے لگی۔ پھر کچھ وقفے کے بعد ناک بھنویں چڑھا کر بولنے لگی ناظرہ سسٹر۔۔۔۔تین بیٹیاں ہیں'۔۔۔۔۔تو ٹھیک ہے؟! لیکن کوئی بیٹا بھی ہوتا۔۔۔۔۔تو اور بھی اچھا ہوتا'۔۔۔۔۔بیٹا'۔۔۔۔بیٹا ہی ہوتا ہے؟!۔''

میں قدسیہ آپا جیسی پڑھی لکھی اور کلچرڈ خاتون کا جواب سن کر حیرت سے اسے تکنے لگی اور خاموش ہی رہی۔ وہ بھی دیگر ان پڑھ خواتین کی طرح ہی سو فیصد پر امید ہو کر' بار بار یہ بات دھرا رہی تھی کہ اس کے بیٹے ضرور اسے لینے کے لئے آجائینگے یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہاں کسی کا بیٹا سالہا سال سے نہیں آیا ہے۔ اگر کسی کا آیا بھی ہے تو وہ صرف اس کے مرنے کے بعد' ماں کا بچا کھچا سامان' ایک دو سونے کے زیورات اور وراثت اور جائیداد بانٹنے کے لئے اس کی ڈیتھ سرٹفکیٹ لیجانے کے لئے آیا ہے۔

اپنی اولاد کی ثناء خوانی سن کر قدسیہ آپا سے رہا نہیں گیا۔ کوئی غم، کوئی چبھتا ہوا احساس یا کوئی قلق، ضرور اس کے اندر، دل کے نہاں خانوں میں کہیں پر موجود ہے۔ جو انہیں اس طرح کی باتوں سے رلا بھی دیتا ہے کہ ان کی آنکھوں سے مسلسل آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگتے ہیں اور گرتے ہی رہتے ہیں۔ جنہیں اکثر وہ اپنے ہاتھوں میں ہمیشہ رہنے والے نیپ کن میں جذب کر لیتی ہیں۔ میں ابھی ان کے ساتھ، اس مختصر سی رفاقت میں وہاں تک نہیں پہنچی ہوں، جہاں سے یہ آنسوں آ کر آنکھوں سے بہہ نکلتے ہیں۔

اور ایک دن پوچھنے لگی "ناظرہ سسٹر اس اولڈ ایج ہوم میں بس ایک تو ہے جو خوش ہے باقی جتنی خواتین ہیں غمزدہ اور مایوس ہیں؟ ایسا کیوں ہے؟" میں نے بھی قدرے بے توجہی سے ہی جواب دے دیا۔ "قدسیہ آپا! یہ آپ بہتر جانتی ہیں۔ مجھے تو ابھی یہاں ایک ہفتہ بھی پورا نہیں ہوا ہے؟" مسکراتے ہوئے کہنے لگی "ہاں بھئی تم سچ کہتی ہو" لیکن قدسیہ آپا کی اپنے ہونٹوں پر پھیلنے والی مسکراہٹوں کے پیچھے کتنی ٹریجڈی چھپی ہوئی ہے یہ میں اچھی طرح سے سمجھ سکتی ہوں۔ بہت خوددار، نبض شناس اور جہاں دیدہ خاتون ہے ہر ایک چہرے کو پڑھنے کا ہنر خوب جانتی ہیں اور دور سے دلوں کے اندر کا بھید پڑھ لیتی ہے۔

پھر پوچھنے لگی۔ ناظرہ تمہارے ہونٹوں پر ہمیشہ جو یہ مسکراہٹ رہتی ہے۔ کیا میں یہ سمجھوں کہ اس میں تمہارے دل اور دماغ کا بھی کچھ رول ہے یا یہ مسکراہٹ تمہارے نرسنگ کے پیشے کی ضرورتوں میں سے ایک ضرورت ہے یا پھر اس کے پیچھے کچھ اور چھپا ہے؟ جیسے اس اولڈ ایج ہوم کی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟؟!!ٗ

میں اس اولڈ ایج ہوم میں بالکل نئی نئی ہی آئی تھی۔ میں قدسیہ آپا سے اتنا گھل مل نہیں گئی تھی اور نہ میں اس کے اسقدر غیر متوقع سوال کے بارے میں فوری طور پر کچھ سوچ سکی تھی۔ میں نے بس ہاں ہوں میں اپنا سر ہلایا تھا۔ اور خاموش ہی رہی تھی۔ کیا پتہ؟ اسے بھی میری اس مسکراہٹ کے پیچھے، میرے دل کے نہاں خانے کی، کسی

تہہ سے کوئی تعلق محسوس ہوا ہو؟!

آج اتوار ہے چھٹی کا دن اور اس اولڈ ایج ہوم میں میرا پہلا اتوار بھی، میں پچھلے سوموار کی صبح کو ہی شہر کے پوش علاقے میں واقع اپنے اچھے خاصے گھر پر چار تالیوں والے تالے چڑھا کر، مستقل طور پر اپنے ضروری سازوسامان کے ساتھ اکیلی ہی، اپنی مرضی سے یہاں منتقل ہو چکی ہوں۔ چابیوں کا ایک ایک سیٹ اپنی تین بیٹیوں کو بھجوا چکی ہوں اور چوتھا سیٹ اپنے پاس رکھا ہے بوقتِ ضرورت شاید کام آجائے۔

صبح صبح ہی قدسیہ آپا میرے کمرے میں اتوار کی معمولات طے کرنے کے لئے آئی ہوئی تھی اور ہم چائے پی کر باتوں میں مشغول تھے۔ اتنے میں چوکیدار حمیرہ، سعدیہ اور راحلہ کو میرے کمرے میں لے آئے۔ میں اپنی تینوں بیٹیوں کو ایک ساتھ یہاں دیکھ کر حیران رہ گئی سلام ودعا کے بعد انہیں بٹھاتے ہوئے قدسیہ آپا کے ساتھ متعارف بھی کرایا جو بہت انہماک کے ساتھ ہمارے حرکات وسکنات کا جائزہ لے رہی تھیں اور میری بیٹیوں کے ساتھ ملنے کا بہت زیادہ اشتیاق بھی رکھتی تھیں۔ قدسیہ آپا ان کے ساتھ ملکر بہت خوش ہوگئی اور انہیں ڈھیر ساری دعائیں دینے لگیں کہ ''تمہاری ماں ناظرہ تم سب بہنوں کی بہت تعریفیں کرتے ہوئے تھکتی نہ تھیں؟ بس ہر بار تم ان کے اعصاب پر چھائی رہتی تھیں وغیرہ وغیرہ''

قدسیہ آپا کا اپنے مخصوص انداز میں یہ کہنا کیا تھا کہ کمرہ رونے اور سسکنے کی آوازوں سے گونجنے لگا۔۔۔؟ وہ بھی، اور میں بھی حیرت سے دیکھنے لگ گئے۔

''امی، خدا کے لئے ہمیں معاف کردو ہمیں ہماری کوتاہیوں کا احساس ہو گیا ہے۔ ہم یہاں آپ کو کسی بھی حالت میں نہیں چھوڑینگے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟! حمیرہ کی آواز مسلسل رونے کی ہچکیوں کے ساتھ آرہی تھی۔

''امی ہمیں معاف کردو جسطرح آپ بچپن میں ہماری شرارتوں کو معاف کیا کرتی تھیں؟

ہم بہت شرمندہ ہیں، ہماری خطائیں ناقابلِ معافی ہیں مگر آپ ہماری ماں ہیں اور آپ کا دل بہت بڑا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟" سعدیہ اپنی رندھی ہوئی آواز میں اس سے آگے کچھ کہہ نہ سکی۔

"امی آپ اپنی بیٹی کو اچھی طرح سے جانتی ہیں۔ اگر آپ ابھی اور اسی وقت ہمارے ساتھ یہاں سے نہیں چلی۔ تو میں خدا کی قسم، یہاں سے ایک قدم بھی نہیں ہٹونگیں۔ پھر آپ جانو اور آپ کا کام؟ بس میں ایک بار کہہ دیتی ہوں۔۔۔۔۔؟" ایک زوردار رونے کی چیخ کے ساتھ یہ چھوٹی والی راحلہ کے الفاظ تھے۔

سسٹر ناظرہ کے اولڈ ایج ہوم کے اس چھوٹے سے ریذڈنشل کمرے میں دو بزرگ خواتین کے علاوہ تینوں جوان خواتین آنسوؤں کے سیلاب میں نہا رہی تھیں اور اب قدرے خاموشی سی چھانے لگی تھی ہر کوئی اس نقطہ انجام تک پہنچتے پہنچتے Next Move کے لئے اپنے آپ کو بے بس ولاچار محسوس کر رہا تھا شاید وہ بھی جس نے گھسیٹتے گھسیٹتے اس کہانی کو یہاں تک پہنچا دیا تھا۔

اتنے میں قدسیہ آپا کا تدبر، بردباری، حوصلہ مندی، ہمت اور معاملہ فہمی یہاں بھی کام آ گئی۔ وہ اپنے آنسو اپنے ہاتھوں میں ہمیشہ رہنے والے نیپ کن میں جذب کرتے ہوئے اٹھی اور چپ چاپ کچھ کہے بغیر، پاس ہی خالی رکھے ہوئے، سسٹر ناظرہ کے سوٹ کیس میں، اس کے کپڑے اور دیگر سامان قاعدے سے رکھنے لگ گئیں۔ اور کمرے میں موجود دیگر لوگ خاموشی کے ساتھ اسے دیکھتے رہے۔

سامان کار میں بھرا جا چکا تھا جسے حمیرہ ڈرائیو کر رہی تھی۔ میں اگلی سیٹ پر اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنی دونوں آنکھیں چھپائی ہوئی بیٹھی تھی۔ قدسیہ آپا کی طرف مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ سعدیہ اور راحلہ پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ کار بس اب اسٹارٹ ہونے ہی والی تھی کہ اگلی سیٹ کی کھڑکی سے جھانکر، کسی نے میرے کانوں میں

دھیمی اور مرجھائی سی آواز میں دوبارہ پوچھنا شروع کردیا۔ ''سسٹر ناظرہ میری سمجھ میں یہ بات اب تک نہیں آرہی ہے کہ تم اس اولڈ ایج ہوم میں اتنا خوش اور مطمئن کیوں رہا کرتی تھی؟ یہ قدسیہ آپا ہی پوچھ رہی تھی۔

اسی دوران کار بھی اسٹارٹ ہوکر آہستہ آہستہ چلنے لگی تھی۔ اپنی آنکھوں سے 'میں نے' ہاتھ اٹھا کر' قدسیہ آپا کے ساتھ آنکھیں چار کرتے ہوئے' انہیں جواب دیا۔

''مسز قدسیہ خان۔۔۔۔' وہ اس لئے کہ۔۔۔۔۔۔' میری صرف یہ تین بیٹیاں ہیں؟ اور کوئی بیٹا نہیں ہے؟؟!!۔

میں دور تک کار کی کھڑکی سے جھانکر قدسیہ آپا کو دیکھ رہی تھی جو وہیں پر کھڑی اپنے دونوں ہاتھ ہلا ہلا کر ہمیں رخصت کررہی تھی۔





بابا

اب میں بھی سٹھ کا ہو گیا ہوں اور سیٹھ سال میں، آٹھ دس سال بے فکری کے کاٹ بھی دو تو نصف صدی کا وقفہ بچ ہی جاتا ہے جو ایک لمبا وقفہ ہوتا ہے۔ میں بابا کو شہر کے اس مصروف ترین بازار کی کشادہ سڑک کے ایک کنارے پر ہمیشہ خاموش بیٹھے ہوئے دیکھتا آرہا ہوں۔

یہ کون ہے؟ کہاں کا ہے؟ اس کا نام کیا ہے؟ یہ کھاتا کیا ہے، پیتا کیا ہے؟ یہاں کب سے ہے؟ راہ چلنے والوں کو اس سب کے ساتھ کیا سروکار؟ شاید پاس پڑوس کے دکان دار اور دیگر لوگ بھی اتنی ابتدائی جانکاری نہیں رکھتے ہونگے؟۔

جھلسا دینے والی گرمی ہو یا خون جما دینے والی ٹھنڈ، برف گر رہی ہو یا بارش ہو رہی ہو یا پھر تیز و تند ہوائیں چل رہی ہوں، یہ بس یہیں بیٹھے ہوئے ملتے ہیں دنیا

دھیمی اور مرجھائی سی آواز میں دوبارہ پوچھنا شروع کر دیا۔ "مسٹر ناظرہ میری سمجھ میں یہ بات اب تک نہیں آرہی ہے کہ تم اس اولڈ ایج ہوم میں اتنا خوش اور مطمئن کیوں رہا کرتی تھی؟ یہ قدسیہ آپا ہی پوچھ رہی تھی۔

اسی دوران کار بھی اسٹارٹ ہو کر آہستہ آہستہ چلنے لگی تھی۔ اپنی آنکھوں سے 'میں نے' ہاتھ اٹھا کر 'قدسیہ آپا کے ساتھ آنکھیں چار کرتے ہوئے' انہیں جواب دیا۔ "مسز قدسیہ خان۔۔۔۔ 'وہ اس لئے کہ۔۔۔۔۔۔ 'میری صرف یہ تین بیٹیاں ہیں؟ اور کوئی بیٹا نہیں ہے؟؟!!۔

میں دور تک کار کی کھڑکی سے جھانکر قدسیہ آپا کو دیکھ رہی تھی جو وہیں پر کھڑی اپنے دونوں ہاتھ ہلا ہلا کر ہمیں رخصت کر رہی تھی۔





بابا

اب میں بھی سٹھ کا ہو گیا ہوں اور سینٹھ سال میں، آٹھ دس سال بے فکری کے کاٹ بھی دو تو نصف صدی کا وقفہ بچ ہی جاتا ہے جو ایک لمبا وقفہ ہوتا ہے۔ میں بابا کو شہر کے اس مصروف ترین بازار کی کشادہ سڑک کے ایک کنارے پر ہمیشہ خاموش بیٹھے ہوئے دیکھتا آرہا ہوں۔

یہ کون ہے؟ کہاں کا ہے؟ اس کا نام کیا ہے؟ یہ کھاتا کیا ہے، پیتا کیا ہے؟ یہاں کب سے ہے؟ راہ چلنے والوں کو اس سب کے ساتھ کیا سروکار؟ شاید پاس پڑوس کے دکان دار اور دیگر لوگ بھی اتنی ابتدائی جانکاری نہیں رکھتے ہونگے؟۔

جھلسا دینے والی گرمی ہو یا خون جما دینے والی ٹھنڈ، برف گر رہی ہو یا بارش ہو رہی ہو یا پھر تیز و تند ہوائیں چل رہی ہوں، یہ بس یہیں بیٹھے ہوئے ملتے ہیں دنیا

چاہے ادھر کی ادھر ہو جائے اسے کوئی سروکار نہیں، یہ بس اپنی ہی دھن میں مگن اپنی اسی جگہ پر ملینگے اور کہیں پر نہیں۔

میں روز اس راستے سے کم از کم دن میں دو بار گذرتا ہوں ایک صبح آتے وقت اور دوسرا شام جاتے وقت۔ میں ہمیشہ سے اسے اسی حالت میں دیکھتا آرہا ہوں۔ ایسے ہی خاموشی اور اطمنان وسکون کے ساتھ براجمان، کسی حرکت وجنبش کے بغیر بیٹھے ہوئے۔

پڑوس کے دکانداروں میں سے کوئی اس کے سامنے کھانے کی پلیٹ یا چائے کا کپ رکھ دیتا ہے تو یہ کچھ کھا پی لیتا ہے نہیں تو پھر اوپر والے کا مہمان؟ کسی سے مانگنا یا طلب کرنا اس کی سرشت میں نہیں۔ راہ چلتے ہوئے لوگوں کے سامنے پھینگے ہوئے پیسے بھی پڑے کے پڑے رہتے ہیں۔ یہ اپنے آپ اور مافیھا سے بالکل ایسے لاتعلق ہیں جیسے اسے کسی چیز کی کچھ خبر ہی نہ ہو۔

سودا سلف لینے کے لئے میں اکثر اس دکاندار کے پاس جاتا ہی رہتا ہوں جو اس بابا کے عقب میں ہی واقع ہے۔ مقامی لوگ بھی اسے بابا ہی کہتے ہیں اور اسی نام سے جانتے ہیں۔ وہ اکثر اپنے کسی سیلز مین کے ذریعے سے چائے کا کپ یا پھر پھل فروٹ وغیرہ اس کے سامنے رکھوا دیتے ہیں طبیعت ہو تو کھا بھی لیتے ہیں ورنہ وہیں کے وہیں پڑے رہتے ہیں۔

اس بزرگ دکاندار سے میں نے کئی بار بابا کے بارے میں کچھ جاننے کی کوشش کی، وہ کچھ بتانے سے قاصر رہے اور اپنی لاتعلقی اور معذوری ظاہر کی اور بتایا کہ وہ جب سے اس جگہ پر مقیم ہیں اور دکان پر بیٹھے ہوئے ہیں وہ بابا کو بس اسی حالت میں دیکھتے آرہے ہیں اس سے زیادہ اسے کچھ خبر نہیں ہے۔

چونکہ یہ شہر خاص کا مصروف ترین روڈ ہے اسلئے صبح سے لے کر رات گئے تک اس پر

آنے جانے والے لوگوں کا بھاری رش بھی لگا رہتا ہے اسلئے دنیا بھر کے لوگوں نے انہیں دیکھا ہوگا اور دیکھتے بھی ہونگے۔

ہوا یوں کہ ایک دن زبردست بارشیں ہوئیں مسلسل اور متواتر زور کی بارشوں نے، ساری وادی کو سمندر میں تبدیل کر دیا۔ نشیبی علاقوں میں دو منزلوں تک پانی بھر گیا۔ دریائے جہلم کے بہتے ہوئے خطرناک ریلے نے جب شہر سرینگر کے اندرونی علاقوں کے گلی کوچوں کا رخ کرلیا اور جارحانہ طور پر ساری رکاوٹوں اور باندھوں کو توڑتے ہوئے بھاگنے اور دوڑنے لگا تو مقامی باشندے دیوانوں کی طرح اونچائیوں کی طرف، سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے بھاگنے لگے۔ سیلاب کے ریلے نے ہر جانب تباہی مچانی شروع کر دی مال وجائیداد کے ساتھ ساتھ قیمتی انسانی جانوں کا اتلاف بھی ہونے لگا کسی کو کسی کی خبر نہ رہی موبائل سسٹم بیکار ہوتے ہی لوگ اپنے عزیز واقارب کے بارے میں معلوم کرتے رہے ہر کوئی اپنی جان بچانے میں لگا ہوا تھا اور باقی سب سے بے خبر تھا۔ یہی تذبذب اور افراتفری کی حالت ہر جانب طاری رہی اور کافی دنوں بلکہ ہفتوں تک طاری رہی۔

اب سیلابی ریلا اتر بھی چکا تھا۔ گرتے ہوئے مکانوں، گیلے گیلے در و دیواروں، کوڑے کرکٹ کے بدبودار اور متعفن ڈھیروں اور ناقابلِ برداشت بدبودار ہواؤں کا ماحول ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ میں بھی اتنے دنوں کے بعد آج پہلی بار اس بربادی کے منظر کو دیکھنے کے لئے یہاں آیا تھا۔ پل پار کرتے ہی جب میں اس بازار سے گزرنے لگا جس کی سڑک کے ایک کونے پر بابا بیٹھا کرتے تھے تو وہ جگہ اتنی مدت کے بعد مجھے خالی ملی۔ نہ جانے مجھے عجیب وغریب قسم کی فکر و پریشانی سی لاحق کیوں ہوگئی؟ پاس پڑوس میں کوئی ایسا شخص بھی نہیں مل رہا تھا جس سے میں اس ضمن میں معلوم کر لیتا۔

اب دو تین مہینے ہو گئے ہونگے اور رفتہ رفتہ سب کچھ بحال ہونے لگا تھا اور اپنی پہلی والی حالت پر آنے لگا تھا لیکن یہاں سے گذرتے وقت ہر بار میری

نظریں اس مخصوص کونے کی جانب جاتی تھیں اور مایوس ہو کر واپس لوٹتی تھیں کہ وہ کونہ سیلاب کے بعد سے بالکل خالی اور ویراں دکھائی دے رہا تھا۔

مجھ سے رہا نہ گیا سودا سلف لاتے وقت میں نے ایک دن پھر اس دکاندار سے اس ضمن میں استفسار کیا۔ اس نے بتایا کہ سیلاب کا ریلا رات کے وقت اس علاقے میں داخل ہو گیا تھا۔ سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں تھے اور کسی کو اندازہ بھی نہیں تھا کہ یہ علاقہ اس طرح اچانک زیرِ آب آجائے گا۔ کچھ لوگ دن میں یہاں سے بھاگ بھی گئے تھے اور بالائی علاقوں کی طرف چلے گئے تھے۔ دوسرے دن ہر جانب بس پانی ہی پانی تھا۔ کہیں کہیں چھتوں پر بھی چیختے چلاتے لوگ دکھائی دے رہے تھے۔ ایک ڈیڑھ منزل تک پانی بھر گیا تھا اور پانی کا بہاؤ بھی اسقدر تیز تھا کہ راستے میں پڑی ہوئی ہر ایک چیز کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا تھا۔

یہ علاقہ زیادہ تر کاروباری لوگوں کا ہے جنہیں اسطرح کے معاملات میں الجھنے کی نہ فرصت ہے نہ مہلت۔ ورنہ ان کی بستی سے ایک شخص اسطرح سے غائب ہو گیا اور انہیں کچھ پتہ ہی نہیں ہے؟۔ جس شخص نے پوری زندگی ان کی ہمسائیگی میں گذاری اور جو بالکل بے ضرر بھی تھا۔ شائد اس لئے بھی کہ یہ شخص کسی کا سگا سمبندھی یا رشتہ دار نہیں تھا۔ ان لوگوں نے اسے اسطرح بھلا دیا کہ بس رات گئی اور بات گئی۔ یہ بات میرے دل اور دماغ میں بہت دیر تک رہی اور مجھے اندر ہی اندر کریدتی بھی رہی۔

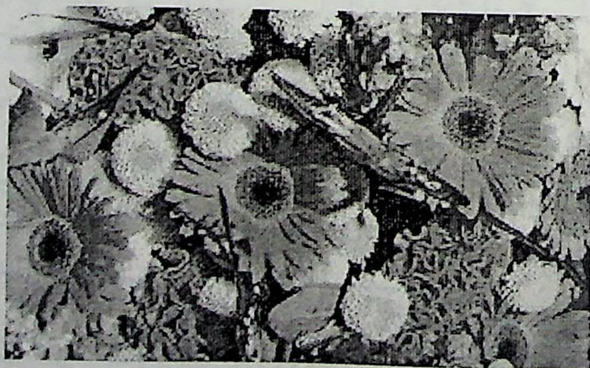
میرے اندر ان لوگوں کے تئیں عجیب قسم کی نفرت سی اُمڈ آتی ہے۔ یہاں سے گذرنا میری مجبوری ہے کہ اس کا اور کوئی متبادل نہیں ہے۔ میں بھیگی آنکھوں سے روز یہاں سے جلدی جلدی گذرتا ہوں۔

ایک دن یوں ہوا کہ میں یہاں سے بالکل ایسے ہی گزر رہا تھا میں نے اس مخصوص کونے میں، جہاں بابا بیٹھا کرتے تھے۔ بچوں، نوجوانوں، بوڑھوں، اور عورتوں وغیرہ کی ایک بھیڑ سی

دیکھی۔لنگر لگا ہوا تھا۔زعفرانی قہوہ اور قلچہ تقسیم ہو رہا تھا اور راہ چلتے ہوئے لوگوں کو پلایا جا رہا تھا۔ پہلے میں نے یہ سمجھا کہ شاید کسی کی شادی ہے اسی لئے اتنی بھیڑ لگی ہوئی ہے لیکن پھر فوراً ہی پتہ چلا کہ معاملہ کچھ دوسرا ہی ہے۔ایک بزرگ نے بتایا کہ تیز سیلاب کے بہاؤ نے کونے میں مدتوں سے بیٹھنے والے بابا کو اپنے ساتھ بہا کر لے جانا چاہا لیکن اس کا لمبا پھرن پاس ہی موجود بنگر کو گھیرنے والی خاردار تار سے الجھ گیا اور سیلاب کا پانی اترتے ہی بابا کا مردہ شریر نکڑ پر پولیس کے بنگر کے پاس ہی پایا گیا۔

مقامی لوگوں نے انہیں پاس کے اپنے مقبرے میں ہی دفن کرلیا۔یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان کے نام و مذہب کے بارے میں کسی کو کچھ پتہ نہیں ہے۔آج شب قدر کے روز ان کے مقبرے پر فاتح خوانی ہوگی اور دن بھر آنے جانے والے لوگوں کو قہوہ پلایا جائے گا غریبوں اور مسکینوں کو کھانا کھلانے کا پروگرام بھی ہے۔

میرے سینے پر سے جیسے منوں بوجھ اتر گیا اور اس دن سے میں جب بھی یہاں سے گزرتا ہوں تو میری نگاہیں نہ جانے خود بہ خود اس جانب کیونکر مرکوز ہو جاتی ہیں جس جانب بابا کا قیام ہوتا تھا۔





چار منگتے

بھکاریوں کی لاتعداد قسمیں ہوسکتی ہیں۔ اگر سنجیدگی سے سوچا جائے تو ہر شخص یہاں بھکاری یا منگتا ہے جتنی زیادہ آپ کی ضرورتیں ہیں اتنا زیادہ آپ کو دوسرے لوگوں کے سامنے دستِ نگر یا منگتا بننا پڑے گا اور اگر آپ کے پاس زندگی کی تمام ضرورتیں ہیں بھی، جو قطعی طور پر ناممکن ہے تو پھر بھی آپ اپنی سانسوں کی ڈور کو قائم و دائم رکھنے کے لئے، ایک ایک سانس کے لئے محتاج و مجبور ہیں۔ دنیا کا کوئی ملک کوئی کونہ ایسا نہیں ہے جہاں پر بھیک مانگنے والے نہیں ہوں ہاں زیادہ یا کم ضرور ہو سکتے ہیں لیکن موجود ہر جگہ پر ہیں اور ضرور ہیں۔ ان کے طور طریقے بھی الگ الگ ہیں۔

لیکن یہ چار منگتے بالکل الگ نوعیت کے ہیں۔ چند دن قبل آفس جاتے وقت بس اڈے کے قریب ایک معمر خاتون اچھے اور صاف ستھرے کپڑوں میں برقع اوڑھے ہوئے بیچ راستے میں اپنی طرف متوجہ کر کے، ہاتھ پھیلا کر، کہنے

لگی۔ ''میرے پاس بس کا کرایہ نہیں ہے'' میں اس کی طرف دیکھ کر بغیر کسی ردِ عمل کے آگے بڑھ گیا اور میرے پیچھے، یونیورسٹی جانے والا ایک اسٹوڈنٹ رکا اور اس نے جیب سے بیس روپئے کا نوٹ نکال کر اسے تھما دیا۔ مجھے قریب ہی بس کے انتظار میں، مقامی بس اڈے پر رکنا تھا جہاں سے مختلف نزدیکی مقامات تک بسیں جاتی ہیں اور کسی بھی جگہ کا کرایہ، دس روپئے سے زیادہ نہیں ہے۔ اسلئے میں اس بزرگ خاتون کی طرف متوجہ رہا کہ اب اس کا نیکسٹ موکیا رہیگا اگر واقعی بس کرائے کے لئے وہ وہاں رکی ہوئی تھی تو پھر اسے فوراً بس میں بیٹھنا تھا اور اگر وہ پیشہ ور بھکاری ہے اور اس نے بھیک مانگنے کا یہ حربہ تلاش کیا ہے۔

تو پھر وہ کسی نئی اسامی کی تلاش میں رہیگی۔

وہ معمر خاتون وہیں پر رکی رہی اور اس کی نگاہیں کسی نئے شکار کو تلاش کرنے میں منہمک رہیں۔ اس کا دستِ سوال راہ چلنے والوں کے آگے دراز ہوتا رہا اور اس دوران کئی لوگوں نے اسے پیسے دے دئے۔

ایک اور دن میں اندرونی شہر کے ایک بہت بڑے قبرستان کے بیچوں بیچ گزرنے والی سڑک پر آفس سے آتے ہوئے اکیلے کار میں جا رہا تھا۔ کہ سڑک کے کنارے ایک عمر رسیدہ شخص نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔ میں جس سمت جا رہا تھا وہیں جانے کی بات کرتے ہوئے مجھ سے کہنے لگے کہ وہ بیمار ہیں کئی دنوں سے اس کے پاس دوائی خریدنے کے لئے پیسے نہیں ہیں اور اب وہ پاس ہی اپنے ایک جانکار کے پاس جا رہے ہیں تا کہ کچھ پیسوں کا انتظام کر کے دوائی خرید سکے۔ میرے پاس کچھ رقم تھی سو اسے پیش کر دی اور وہ دعائیں دیتے ہوئے اس جگہ پر اتر گئے۔

دس بیس روز بعد میں پھر اسی راستے پر لگ بھگ اسی وقت، گذرنے لگا۔ وہی بزرگ شخص انہی الفاظ کو دھراتے ہوئے میری گاڑھی میں پھر بیٹھ گئے۔ اس بار

میں نے فوری ردِعمل نہیں دکھایا اس بزرگ سے عرض کرنے لگا کہ میں بھی اس کے ساتھ، اس کے دوست تک چلوں گا تا کہ اس سے ملاقات کا نیاز حاصل کرسکوں۔ میرا یہ کہنا تھا کہ اس حضرت کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ اس کے اندر کی اضطرابی کیفیت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ لیکن اس طرح کی صورت حال سے نمٹنے کے لئے بھی ان کے پاس پہلے سے ہی سوچے ہوئے نسخے ہوتے ہیں اپنی جیبیں ٹٹولتے ہوئے، مجھے رکنے کے لئے کہنے لگے کہ گھر پر نسخہ بھول آئے ہیں۔ میں نے سائڈ میں گاڑھی روک دی اور اسے اتارتے ہوئے، عرض کرنے لگا۔ جناب آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟ ابھی کچھ روز قبل بھی آپ مجھے اسی راستے پر ملے تھے اور ہو بہو انہیں الفاظ کے ساتھ ملے تھے۔ میرے پاس جو تھا پیش کیا تھا کیا آپ کو نہیں لگ رہا ہے کہ آپ کو کوئی نئی بات تلاش کرنی ہوگی کہ ایک ہی بات، بار بار اور بہت دیر تک نہیں چلتی؟۔ وہ بزرگ نظریں جھکائے کسی ردِعمل کے بغیر ہی، خاموشی کے ساتھ وہاں سے چل دئے۔

میں اپنے قریبی پڑوسی کے گھر گیا ہوا تھا۔ ہم دونوں دالان پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک ادھیڑ عمر کا شخص میلے کچیلے، کٹے پھٹے کپڑوں میں ملبوس ہماری طرف آ رہا تھا۔ ملگجے چہرے پر لمبی داڑھی تھی جس پر جگہ جگہ چاندی کے تاروں نے قبضہ جمانا شروع کر دیا تھا اور بال شاید لمبے وقفے سے نہیں کاٹے گئے تھے اسلئے ادھر ادھر بکھر گئے تھے اور منتشر دکھائی دے رہے تھے۔

نو وارد شخص ہمارے قریب آ کر دستِ سوال دراز کرنے لگا۔ میرے پڑوسی امین صاحب نے بڑی سرعت سے پانچ روپئے کا سکہ تلاش کر کے اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے سکہ پر ایک نظر دوڑا کر اسے نہ لیتے ہوئے واپس گیٹ کی طرف اپنا رخ کر لیا اور جانے لگا۔

ابھی وہ چار قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ امین صاحب جیسے پڑھے لکھے اور صاحب

ثروت اور بڑے ملنسار و بردبار شخص نے بھی اس نو وارد بھکاری کے اس عمل کو، میری موجودگی میں، بہت برا محسوس کرتے ہوئے اسے آواز دی۔ ''رکو بھائی رکو؟!''

وہ شخص پیچھے مڑ کر شاید اس امید میں رک کر ہماری طرف بڑھنے لگا کہ شاید کچھ زیادہ ملے گا۔ امین صاحب حالانکہ بڑے نرم مزاج، ملنسار اور صبر و تحمل پسند واقع ہوئے ہیں، اس سے کہنے لگے۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟!''

''حبیب اللہ۔۔۔۔،'' اس نے جواب دیا۔

حبیب اللہ۔۔۔۔؟ مہربانی کر کے یہ بتاؤ کہ تمہارا باپ، تمہیں دینے کے لئے میرے پاس کتنی رقم چھوڑ کر گیا ہے۔۔۔۔؟!!'' یا پھر میں تمہاری کتنی رقم کا مقروض ہوں؟ تا کہ تمہیں یک مشت اور ابھی ادا کر سکوں؟!''

قریب کی مسجد کے لاوڈ اسپیکر سے بلند آواز میں اذانِ عصر بلند ہونے لگی اور یہ ادھیڑ عمر کا بھکاری، معنی خیز انداز میں چپ رہا اور یہاں تک کہ امین صاحب دوبارہ محوِ کلام ہو گئے۔

''حبیب اللہ۔۔۔۔تم۔۔۔بھکاری ہو۔۔۔۔بھیک مانگنے والے۔۔۔منگتے۔۔۔۔جو شخص، تمہاری آواز پر اپنی مصروفیات ترک کر کے، متوجہ ہو جائے اور تمہیں اپنی خون پسینے کی کمائی میں سے کچھ دے دے، خواہ وہ ایک پیسہ ہی کیوں نہ ہو، یہ اس کا احسان ہے۔ تمہیں اسے چپ چاپ کر کے قبول کر لینا چاہئے خواہ تم کو وہ ایک پیسہ بعد میں دریا میں ہی کیوں نہ پھینکنا پڑے؟ تمہیں دینے والے کے جذبے اور احسان کو دیکھنا چاہئے اور اس کی قدر کرنی چاہئے کہ وہ کسی مجبوری یا دباؤ سے نہیں بلکہ اپنی رضاء اور فراخدلی سے تمہیں دے رہا ہے اور تم ہو کہ۔۔۔۔۔۔۔؟؟!!۔

حبیب اللہ اپنی جگہ سے ہٹا نہ اس نے اپنی، امین صاحب پر جمائی ہوئی نظریں ہی کسی اور جانب پھیر دیں؟

اذان ادا ہو چکی تھی اور لوڈ اسپیکر بھی اب بند ہو چکا

تھا۔ حبیب اللہ بھی امین صاحب کی طرح ہی آہستہ آہستہ اور سمجھانے کے انداز میں، دھیمے دھیمے لہجے میں بڑے مہذبانہ انداز میں جواب دینے لگا۔ "حضرت آپ بالکل بجا فرما رہے ہیں۔ میں آپ ہی کے الفاظ دہرا کر آپ سے پوچھنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ کیا آپ خود اپنے کہے پر کاربند ہیں۔۔۔۔۔؟

۔۔۔۔۔نہیں ہرگز نہیں۔۔۔۔؟ معاف کیجئے گا۔۔۔؟ آپ بھی میری طرح بھکاری ہی تو ہیں۔۔۔؟ کیا آپ ایک ایک سانس کے لئے مجبور و محتاج نہیں ہیں۔۔۔۔؟ ایک سانس لینے کے بعد۔۔۔۔۔ دوسرے سانس کے لئے۔۔۔۔ میری طرح ہی اپنا دستِ سوال نہیں پھیلاتے۔۔۔۔؟ جو آپ کی طرف' ہر لمحہ ہر پل متوجہ ہو کر آپ کے لئے سب کچھ میسر اور بہم رکھتا ہے۔ یہ اس کا کتنا بڑا احسان اور کرم ہے۔۔؟ آپ خاموشی سے اسے قبول بھی کر لیتے ہو۔۔؟ میری طرح ٹھکراتے بھی نہیں۔۔۔؟ آپ کو ہر پل ہر گھڑی اس کے جذبے اور اس کے احسان کی قدر نہیں کرنی چاہئے کیا؟ کہ وہ کسی مجبوری سے نہیں' بلکہ اپنی رضامندی اور فراخدلی سے آپ کو سب کچھ دے رہا ہے اور آپ ہو کہ۔۔۔۔؟؟ کیا آپ کی نظر۔۔۔۔۔' آپ کی اوقات پر ہے۔۔۔۔۔۔۔؟؟!!"

نہ جانے امین صاحب جیسے جہاں دیدہ فلسفی شخص' اس ادھیڑ نو وارد کی طرف ٹکٹکی باندھ کر کیا دیکھنے لگے اور کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے اور اس طرح متوجہ ہو گئے جیسے وہ بت بن گئے ہوں وہ بالکل خاموش تھے جیسے ان سے کوئی جواب ہی نہیں بن پا رہا تھا اور میں۔۔۔۔۔۔۔ ان دونوں گیانی لوگوں کی باتیں بڑے انہماک اور خاموشی کے ساتھ سن رہا تھا اور حیران بھی تھا کہ یہ ادھیڑ عمر کا میلا کچیلا شخص افلاطوں کی طرح ہی، کسقدر باتونی اور فلسفیانہ فکر و سوچ والا ہے جسے ہم ایک بھکاری سمجھ بیٹھے تھے' کہ ایک اچھا خاصا پڑھا لکھا شخص بھی اس کے آگے جیسے بے بس و لاچار دکھائی دے رہا ہے؟۔

امین صاحب ابھی تک کسی سوچ میں مستغرق تھے اور میں بھی خیال و خواب کی وادیوں

میں بھٹک رہا تھا۔ چار سو خاموشی سی چھائی ہوئی تھی کہ حبیب اللہ کے صحن سے باہر نکلنے سے، آہنی گیٹ کے بند ہونے سے پیدا شدہ آواز وارتعاش نے ہمیں جگا دیا۔

امین صاحب کچھ زیادہ ہی دھیمے لہجے میں مجھ سے مخاطب ہونے لگے۔ "اشرف صاحب دیکھا۔۔۔۔۔؟ اس آدمی نے مجھے کس طرح جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔۔۔؟ یہ مت سمجھنا کہ یہ کوئی بھکاری تھا اور بھیک مانگنے آیا تھا۔۔؟ یہ جو کوئی بھی تھا؟ سو تھا۔۔۔؟ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔ ہاں مجھے بس اتنا پتہ ہے کہ یہ مجھے احساس دلانے آیا تھا اور یہ بتانے آیا تھا کہ ہم۔۔۔۔؟ خاص طور پر میں کتنا بڑا احسان فراموش ہوں۔

یہ کہتے ہوئے امین صاحب کی آواز اور دھیمی پڑ گئی اور رندھ سی گئی۔ میں نے ان سے اجازت لی اور ان کے صحن سے باہر آ گیا۔ میں یہ سوچنے لگا کہ ہر موضوع اور ہر معاملے پر اپنے پیتل کو، اپنے قوتِ استدلال سے سونا ثابت کرنے والے امین صاحب کہاں کھو گئے اور ان کے احساسِ فروتری اور ان کی خودسرانا کا کیا ہوا؟ کہ بظاہر اس بھکاری سے اسقدر متاثر و مرعوب ہو گئے جس کا نہ کہیں کوئی ٹھور ہے نہ ٹھکانہ؟ مجھے تعجب بھی ہوا کہ کسی کے، سیدھے سادھے الفاظ اسقدر بھی متاثر کن ہو سکتے ہیں کہ امین صاحب جیسے شخص کی کایا ہی پلٹ کر رکھ دیں اور انہیں ایک ہی نظر میں، اپنے اعمال و افعال کا بھر پور محاصبہ کرنے کی طرف راغب بھی کر دیں۔

امین صاحب کے صحن سے باہر آئے ہوئے اب مجھے پورے دو گھنٹے ہو گئے ہیں اور میں نے قرب و جوار میں کونہ کونہ، حبیب اللہ کی تلاش میں چھان مارا ہے لیکن وہ ادھیڑ عمر کا بھ۔۔۔کا۔۔ری کیا اس کی چھایا تک مجھے نہیں ملی!

آپ شاید سوچ رہے ہونگے کہ مجھے اسے تلاش کرنے کی کیا ضرورت پڑی؟

میں چاہتا تھا۔۔۔کہ۔۔میں بھی۔۔۔۔اس سے۔۔۔کچھ۔۔۔

تھا۔ حبیب اللہ بھی امین صاحب کی طرح ہی آہستہ آہستہ اور سمجھانے کے انداز میں، دھیمے دھیمے لہجے میں بڑے مہذبانہ انداز میں جواب دینے لگا۔ ''حضرت آپ بالکل بجا فرمارہے ہیں۔ میں آپ ہی کے الفاظ دہرا کر آپ سے پوچھنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ کیا آپ خود اپنے کہے پر کاربند ہیں۔۔۔۔۔؟

۔۔۔۔۔نہیں ہرگز نہیں۔۔۔۔؟ معاف کیجئے گا۔۔۔؟ آپ بھی میری طرح بھکاری ہی تو ہیں۔۔۔؟ کیا آپ ایک ایک سانس کے لئے مجبور و محتاج نہیں ہیں۔۔۔۔۔؟ ایک سانس لینے کے بعد۔۔۔۔۔دوسرے سانس کے لئے۔۔۔۔میری طرح ہی اپنا دستِ سوال نہیں پھیلاتے۔۔۔۔؟ جو آپ کی طرف، ہر لمحہ ہر پل متوجہ ہو کر آپ کے لئے سب کچھ میسر اور بہم رکھتا ہے۔ یہ اس کا کتنا بڑا احسان اور کرم ہے۔۔؟ آپ خاموشی سے اسے قبول بھی کر لیتے ہو۔۔۔؟ میری طرح ٹھکراتے بھی نہیں۔۔۔؟ آپ کو ہر پل ہر گھڑی اس کے جذبے اور اس کے احسان کی قدر نہیں کرنی چاہئے کیا؟ کہ وہ کسی مجبوری سے نہیں، بلکہ اپنی رضامندی اور فراخدلی سے آپ کو سب کچھ دے رہا ہے اور آپ ہو کہ۔۔۔۔۔؟؟ کیا آپ کی نظر۔۔۔۔۔۔' آپ کی اوقات پر ہے۔۔۔۔۔۔۔؟؟!!''

نہ جانے امین صاحب جیسے جہاں دیدہ فلسفی شخص، اس ادھیڑ نووارد کی طرف ٹکٹکی باندھ کر کیا دیکھنے لگے اور کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے اور اس طرح متوجہ ہو گئے جیسے وہ بت بن گئے ہوں وہ بالکل خاموش تھے جیسے ان سے کوئی جواب ہی نہیں بن پارہا تھا اور میں۔۔۔۔۔۔۔۔۔ان دونوں گیانی لوگوں کی باتیں بڑے انہماک اور خاموشی کے ساتھ سن رہا تھا اور حیران بھی تھا کہ یہ ادھیڑ عمر کا میلا کچیلا شخص افلاطوں کی طرح ہی، کسقدر باتونی اور فلسفیانہ فکر و سوچ والا ہے جسے ہم ایک بھکاری سمجھ بیٹھے تھے' کہ ایک اچھا خاصا پڑھا لکھا شخص بھی اس کے آگے جیسے بے بس و لاچار دکھائی دے رہا ہے؟۔

امین صاحب ابھی تک کسی سوچ میں مستغرق تھے اور میں بھی خیال و خواب کی وادیوں

میں بھٹک رہا تھا۔ چارسو خاموشی سی چھائی ہوئی تھی کہ حبیب اللہ کے صحن سے باہر نکلنے سے، آہنی گیٹ کے بند ہونے سے پیدا شدہ آواز وارتعاش نے ہمیں جگا دیا۔

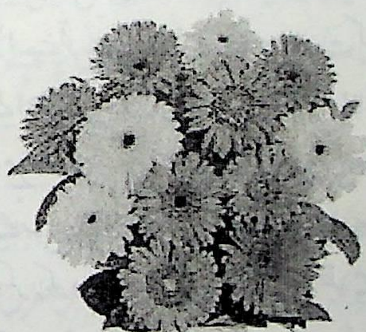
امین صاحب کچھ زیادہ ہی دھیمے لہجے میں مجھ سے مخاطب ہونے لگے۔ ''اشرف صاحب دیکھا۔۔۔۔۔؟ اس آدمی نے مجھے کس طرح جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔۔۔؟ یہ مت سمجھنا کہ یہ کوئی بھکاری تھا اور بھیک مانگنے آیا تھا۔۔؟ یہ جو کوئی بھی تھا؟ سو تھا۔۔۔۔؟ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔ ہاں مجھے بس اتنا پتہ ہے کہ یہ مجھے احساس دلانے آیا تھا اور یہ بتانے آیا تھا کہ ہم۔۔۔۔؟ خاص طور پر میں کتنا بڑا احسان فراموش ہوں۔

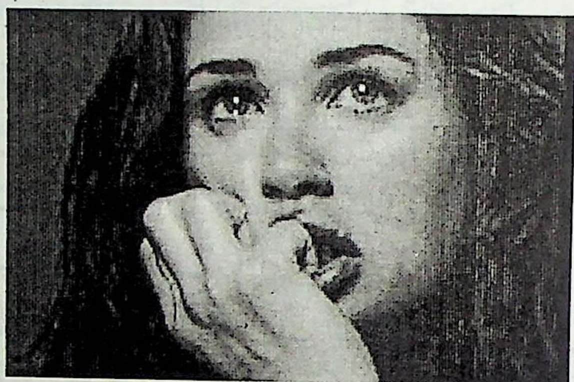
یہ کہتے ہوئے امین صاحب کی آواز اور دھیمی پڑ گئی اور رندھ سی گئی۔ میں نے ان سے اجازت لی اور ان کے صحن سے باہر آ گیا۔ میں یہ سوچنے لگا کہ ہر موضوع اور ہر معاملے پر اپنے پیتل کو، اپنے قوتِ استدلال سے سونا ثابت کرنے والے امین صاحب کہاں کھو گئے اور ان کے احساسِ فروتری اور ان کی خودسرانا کا کیا ہوا؟ کہ بظاہر اس بھکاری سے اسقدر متاثر و مرعوب ہو گئے جس کا نہ کہیں کوئی ٹھور ہے نہ ٹھکانہ؟ مجھے تعجب بھی ہوا کہ کسی کے، سیدھے سادھے الفاظ اسقدر بھی متاثر کن ہوسکتے ہیں کہ امین صاحب جیسے شخص کی کایا ہی پلٹ کر رکھ دیں اور انہیں ایک ہی نظر میں، اپنے اعمال و افعال کا بھرپور محاصبہ کرنے کی طرف راغب بھی کر دیں۔

امین صاحب کے صحن سے باہر آئے ہوئے اب مجھے پورے دو گھنٹے ہو گئے ہیں اور میں نے قرب و جوار میں کونہ کونہ، حبیب اللہ کی تلاش میں چھان مارا ہے لیکن وہ ادھیڑ عمر کا، بھ۔۔۔کا۔۔ری کیا اس کی چھایا تک مجھے نہیں ملی!

آپ شاید سوچ رہے ہونگے کہ مجھے اسے تلاش کرنے کی کیا ضرورت پڑی؟ میں چاہتا تھا۔۔۔کہ۔۔۔میں بھی۔۔۔۔اس سے۔۔۔کچھ۔۔۔

موٹی موٹی ۔۔۔گالیاں کھالوں۔کیونکہ۔۔۔' میں ۔۔۔اپنے پڑوسی۔۔۔۔امین صاحب سے ۔۔۔بھی' ۔۔۔۔۔اس معاملے میں ۔۔۔۔۔۔بہت زیادہ۔۔۔گیا۔۔۔ گذرا۔۔۔۔۔ہوں!! کہ لمبی داڑھی ۔۔۔۔بھی رکھی ہے اور نمازیں بھی پڑھتا نہیں ۔۔۔۔ٹھونکتا ہوں؟ لیکن ۔۔۔یہ سب بے لوث کہاں ہر حرکت کے پیچھے کوئی نہ کوئی ذاتی غرض کوئی نہ کوئی لالچ کوئی نہ کوئی انفرادی مقصد ہوتا ہے۔ایسا لگتا ہے کہ میں ان سب منگتوں سے بھی، بہت بڑا گیا گزرا منگتا ہوں؟!۔





پانچ مشٹنڈوں کی ماں بہن، ماری گئی؟!۔۔۔۔۔۔

فریدہ خون کے آنسو رو رہی تھی اس کی تینوں بچیاں صوفیہ، صبا اور بشریٰ بھی، اور میں۔۔۔۔۔۔۔؟ انسان کی بے بسی، کبھی کبھار اسے کتنا لاچار بنا دیتی ہے کہ وہ بہت کچھ کرنا چاہتا ہے لیکن مصلحت اندیشی اور پھر انجام کی فکر، اسے معذور و مفلوج بنا دیتی ہے بہت کم لوگ ہی ایسے ہیں جن کی نظر ہمیشہ اپنے اوپر ٹکی رہتی ہے اور جو ہمیشہ اپنا احتساب کرتے رہتے ہیں اور بس کرتے ہی رہتے ہیں۔

صبح صبح بچیوں کو کسی سہیلی کا فون آیا تھا۔ شہر کے ایک مصروف ترین علاقے کی سڑک پر ایک لاوارث ادھیڑ عمر کی، عورت کی لاش انتہائی کسمپرسی کے حالت میں پائی گئی تھی۔ کسی نے اس اجنبی عورت کی تصویر فیس بک پر ڈال دی تھی۔ یہ لاش،۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کس کی تھی؟؟!!۔

یہ لاش ۔۔۔۔۔۔۔۔ ماریا کی تھی۔جی ہاں پانچ مشٹنڈوں کی ماں بہن ۔۔۔۔۔ ماریا کی؟!۔جو فریدہ کی خالہ زاد بہن تھی۔

فریدہ زاروقطار رو رہی تھی اور بار بار دہرا رہی تھی کہ "میری بہن لاوارث نہیں ہے ۔۔۔؟ میری بہن لاوارث نہیں ہے۔اس کے چار مشٹنڈے، بے غیرت بھائی اسی شہر کی اچھی اچھی کالونیوں میں، بڑے بڑے گھروں میں، اپنے اپنے بال بچوں کے ساتھ موج مستی کر رہے ہیں اور اس کا اپنا خون، اس کی کوکھ سے جنما، اس کا ناعاقبت اندیش اکلوتا سگا بیٹا، اپنے گھر میں مزے لے رہا ہے۔اسکے سگے سمبندھی قریبی رشتہ داروں کی ایک بہت بڑی فوج بھی ہے جو عیش وآرام سے، اپنے اپنے گھروں میں رہ رہے ہیں۔

حمید، فریدہ کا چھوٹا بھائی ہے۔جب تک ان لوگوں تک یہ خبر پہنچی، تب تک چار بھائیوں اور ایک بہن کی بہن، دو شادی شدہ بیٹیوں اور ایک شادی شدہ بیٹے کی ماں اور خونی رشتہ داروں کے ایک بہت بڑے ٹولے کی، ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ماریا، شہر کی ایک مصروف سڑک پر لاوارث لاش بن کر پڑی تھی۔حمید کے بھاگے بھاگے وہاں پہنچنے تک، یہ لاوارث لاش، مقامی پولیس تھانے تک پہنچا دی گئی تھی۔کاش آج ماریا کی چھوٹی بہن، حمید کی بیوی، شکیلہ ہوتی؟ جو دور دور تک، سب کی خبر رکھنے والی ہمدرد و مشفق خاتون تھی وہ اپنی بہن کو اسطرح، ان ناعاقبت اندیش لوگوں کے رحم وکرم پر ہرگز نہ چھوڑتی۔اور اپنی بہن کو اپنے سینے سے اسطرح لگائے رکھتی کہ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ لگتی۔

فریدہ کی آنکھوں سے اب بھی خود بخود آنسوؤں کی ایک دھارسی بہہ رہی تھی جس نے اس کا ڈوپٹہ مکمل طور پر بھگو دیا تھا۔اس وقت جس ذہنی کرب سے وہ گذر رہی تھی میں اچھی طرح سے اس کا اندازہ لگا سکتا تھا۔اسے پوری طرح سے سمجھ سکتا تھا اور محسوس بھی کر سکتا تھا آخر میں اس کا شوہر ہوں چالیس پنتالیس سال کا ساتھ ہے ہم ایک دوسرے کے مزاج اور نفسیات کو اچھی طرح سے سمجھ نہ سکیں تو پھر کون سمجھ سکے گا؟ رہ رہ کر اسے لاتعداد

باتیں یاد آرہی ہونگیں۔ابھی چند روز قبل، مجھ سے پوچھ کر، ماریا کو اپنے ساتھ اپنے گھر لانے کے لئے مینٹل اسپتال، اپنی بیٹی صبا کے ساتھ گئی ہوئی تھی اور ماریا کی کافی منت سماجت کی تھی کہ وہ اس کے گھر آجائے۔لیکن جس ماریا کو اپنے بڑے خداترس، عبادت گزار، حال ہی میں حاج الحرمین بننے والے اپنے سگے بھائی نے کئی بار پاگل خانے میں ڈلوادیا تھا اور اپنے مکروہ اور مردار ارادوں کی تکمیل کے لئے پاگل ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی اس دوراندیش، فرض شناش اور بردبار بہن نے، فریدہ کو لاجواب کردیا تھا جب روتے روتے اسے یہ کہہ دیا تھا کہ "بہن میرے لئے اب موت بھی ---------؟ میں آپ کے گھر میں کس حیثیت سے رہنے لگوں----؟ ہم جس شریعت کے پیروکار ہیں وہ ہمیں اس کی اجازت نہیں دیتا--------؟ آپ کے میاں میرے بھائی جیسے ہی سہی، لیکن میں---کون سا منہ لے کر، اس کے گھر کو اپنا گھر سمجھنے لگوں----!!؟؟" پھر یہ تینوں جی بھر کے روئیں تھیں اور کافی دیر تک روئیں تھیں۔

پھر جب اسپتال والے ماریا کو گاڑی میں بٹھا کر

منجھلے والے مشٹنڈے کے گھر چھوڑ گئے تھے تو انسانیت کے نام پر فحش گالی اور ایک بدنما داغ بھائی، اپنی جورو کے ڈر سے، اسے گاڑی میں بٹھا کر، بڑے مشٹنڈے کے پاس لے گیا اور اس کی زمہ داری نہ لینے پر، اسے یہ کہتے ہوئے بلیک میل بھی کرنے لگا کہ وہ ماریا کو حال ہی میں بیاہی گئی اس کی بیٹی کے سسرال میں چھوڑ کے آئے گا۔پھر وہ اپنی بہن کو مجبوراًا اپنے پاس رکھنے کے لئے راضی ہوگیا وہ بھی اسطرح کہ اپنے گھر میں نہیں رکھا، جہاں وہ اپنے دیگر اہل خانہ کے ساتھ بودوباش اختیار کئے ہوئے تھا بلکہ شہر کے ایک دوسرے کونے پر کرائے پر لئے گئے ایک کمرے میں ٹھہرادیا۔تنہا اور اکیلا۔

فریدہ کو مینٹل اسپتال کے ڈاکٹروں نے بتادیا تھا کہ ماریا کچھ

نہیں کھاتی یا پیتی ہے صرف اپنے گھر والوں کو بار بار یاد کرتی ہے اور ڈھونڈتی ہے اور

مقامی میڈیکل انسٹچوٹ میں اس کی Endscopy سے پتہ چلا ہے کہ یہ سرطانِ معدہ کے مرض میں مبتلا ہے جس کی ایک لازمی علامت بھوک کا مرجانا بھی ہے۔

یہ پانچوں مشٹنڈے یہ سب جانتے تھے پھر بھی ان مردہ ضمیروں میں سے کسی ایک کا ضمیر نہیں جاگا اور نہ ہی ان کے گندے اور غلیظ خون میں کسی طرح کا ابال ہی آیا۔ یہاں تک کہ شہر کے دوسرے کنارے پر اس مصروف ترین سڑک پر اس کا انتقال ہوگیا۔ سب لوگ حیران ہیں کہ ماریا یہاں تک کیسے اور کس طرح پہنچی؟ جبکہ وہ اتنی لاغر و کمزور ہو چکی تھی کہ اس سے مشکل سے ہی اٹھا جاتا تھا۔

فریدہ اب تک مسلسل روتی جارہی تھی اور میرے سامنے اسطرح کی سب باتیں دھراتی جارہی تھیں۔ میں بھی اسے یہ جان کر چپ نہیں کرارہا تھا کہ اس کے دل و ذہن سے غبار چھٹ جائے گا جو اگر اس کے اندر رہا تو اس کا کلیجہ پھٹ جائے گا اور وہ نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ جائے گی ورنہ یہ سب واقعات میرے سنائے تھے اور کچھ کا میں چشم دید گواہ بھی تھا لیکن پھر بھی میں اسطرح غور و تفکر کے ساتھ انہیں سن رہا تھا کہ جیسے پہلی بار سن رہا ہوں۔

فریدہ بتارہی تھی کہ یہی ننگ انسانیت و اخلاق اور مردہ ضمیر، بڑی بڑی دین کی باتیں کرنے والا نامراد بڑا مشٹنڈا ہی، اپنی اس بیمار و مجبور اور بے بس و لاچار بہن کو، برقعہ اوڑھا کر، آٹو میں بٹھا کر، ایک روز لعل بازار لے گیا تھا، جہاں اسے کبھی بیاہا گیا تھا اور اس کا میکا ہوا کرتا تھا، پھر وہاں کی مقامی مسجد کے دروازے پر اس کے ہاتھوں میں ایک پرچہ تھما کر، بھاگ گیا تھا جس پر یہ لکھا ہوا تھا کہ اس عورت کا نام ماریا ہے اور یہ مسجد کے قریب ہی، اسی محلے میں رہنے والے فلاں خاندان کی گمشدہ بہو ہے، جہاں اس کی دو بالغ بیٹیاں اور ایک بیٹا بھی رہتا ہے، جن کے نام یہ یہ ہیں۔

لوڈ اسپیکر پر اس کا اعلان سنتے ہی، اس کا چھوٹا دیور اس لئے اسے اپنے

ساتھ اپنے گھر لیجانے کے لئے آیا تھا کہ ماریا بھابی نے اسے بچپن میں بہت بار کھلایا پلایا تھا لیکن ماریا نہیں گئی اس نے اس کے سامنے بھی وہی باتیں دہرا کر اس کے ساتھ جانے سے معذرت ظاہر کر دی جو باتیں اس نے اپنی خالہ زاد بہن فریدہ کے سامنے دہرائی تھیں۔

متعلقہ پولیس ایس ایچ او نے حمید کو ماریا کی لاش اس لئے دینے سے انکار کر دیا کہ جب قریبی خونی رشتہ دار شہر میں موجود ہوں تو لاش ضروری لوازمات کو پورا کرنے کے بعد انہی کے سپرد کر دی جائیگی۔ ان کی موجودگی میں، دور کے رشتہ داروں کو نہیں۔

کچھ وقفے کے بعد ماریا کا بڑا مشٹنڈا بھی آ گیا جو پولیس محکمے میں ریٹائرڈ ملازم تھا۔ اسلئے کچھ دیر تک وہ اور اسکا بے ضمیر اکلوتا بھانجا پولیس کے ساتھ معاملہ نمٹا کر لاش لے کر باہر آ گئے اور پھر۔۔۔ ماریا اپنے آبائی قبرستان میں ایسے دفن ہو گئی جیسے۔۔۔۔۔۔ کبھی تھی ہی نہیں۔۔۔۔۔؟!!۔

اس کے سارے بے غیرت اور مردہ ضمیر مشٹنڈے اپنے اپنے گھروں کو لوٹے اور۔۔۔۔ ماریا اپنے دائمی گھر کو۔۔۔؟!!

ماریا کو اب اپنے دائمی گھر کو لوٹے ہوئے ایک سال گذر گیا ہو گا۔ لیکن آج بھی فریدہ وقفے وقفے سے زار و قطار رونے لگتی ہے جب اسے اپنی بہن ماریا کی یاد آجاتی ہے۔ میں اور اس کی بیٹیاں فوراً جان جاتی ہیں کہ اسے ماریا کی یاد آ گئی ہے۔ ہم اسے کچھ نہیں کہتے، نہ تسلیاں دیتے ہیں اور نہ اس کی ڈھارس ہی بندھا دیتے ہیں نہ اسے چپ ہی کرا دیتے ہیں ہم سب بھیگی بھیگی پلکوں سے، کمرے سے، ایک ایک کر کے باہر نکل جاتے ہیں اور اسے تنہا چھوڑ دیتے ہیں کہ اس کی چھاتی پر پڑا ہوا ہمالیہ پہاڑ جیسا بوجھ، کچھ ہلکا ہو جائے پھر کچھ دیر بعد ایسا ہی ہو جاتا ہے اور وہ دوبارہ اس دنیا میں لوٹ کر آجاتی ہے۔ اور اپنی بے بس و ناتواں آنکھوں سے، اپنے سر پر پڑے ڈوپٹہ سے، آنسو پونچھنے لگتی

ہے یہ سلسلہ اس کے ساتھ پچھلے ایک سال سے جاری ہے اور شاید عمر بھر جاری رہیگا۔اپنی ہمدرد و مشفق بہن کو اتنی جلدی کوئی بھلا سکتا ہے؟ صرف ان مشٹنڈوں کے بغیر، جو اپنی بہن، اپنی ماں ماریا کو جیتے جی ہی بھول گئے۔

کشمیر کے ایک سینئر جرنلسٹ کے تاثرات

جہاں تک نثر نگاری کا تعلق ہے تو یہاں بھی ان کا کینوس کافی وسیع نظر آتا ہے۔وہ افسانے بھی لکھتے ہیں اور تنقیدی مضامین بھی، قلمی خاکے بھی لکھتے ہیں اور انشائیے بھی ضبطِ تحریر میں لاتے ہیں۔

کتابوں پر تبصرہ کرنا ان کا پسندیدہ شغل ہے اور مجھے یہ بات قبولنے میں کوئی جھجک نہیں ہوتی کہ ان کے تبصرے جاندار بھی ہوتے ہیں اور شاندار بھی، اشرف آثاری چونکہ پیشے سے ایک ڈاکٹر ہیں، اس لئے صحت کے تعلق سے مختلف موضوعات پر ان کے مضامین بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔ان کی کئی کتابیں اس حوالے سے منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ وجیہہ احمد اندرابی ''

ہم پانچ

رفیع صاحب نے اس غریب و مفلوک الحال مچھیرے کو سڑک کے بیچوں بیچ، گریباں سے پکڑ کر، بہت سخت الفاظ میں ڈانٹنا ڈپٹنا شروع کر دیا اور وہ غریب روہانسی آواز میں دھیمے لہجے میں، بس اتنا کہہ رہا تھا کہ "رفیع صاحب.........خدا کی قسم میں سچ کہتا ہوں.....اگر آپ نے مجھے زیادہ مجبور کیا....تو میں .....چلتی ہوئی گاڑی کے ....نیچے اپنے آپ کو .....ڈال دوں گا؟؟!!۔

میں نے رفیع صاحب سے پوچھا۔ "بھائی غریب کا کیا قصور ہے؟ آپ اس پر کیوں اتنا بگڑ رہے ہیں؟" کہنے لگے "یہ ایک مفلس و نادار مچھیرا ہے۔ اس کا نام ستار گاڑہ ہانز ہے۔ کچھ سال قبل اس نے دو ہزار روپئے رعائتی شرح سود پر، جال بننے کے لئے، ایک مقامی بینک کی شاخ سے قرضہ لیا تھا۔ جو آج تک ادا نہ ہوا۔ نہ اس کی قسطیں ہی جمع ہوگئیں اور نہ اس کا سود ہی، یہاں تک وہ قرضہ چار ہزار اور کچھ سو روپئے بن گیا۔ اب ستار کے پاس نہ اصل رقم ہے اور نہ سود کے پیسے ہی؟۔ کئی بار میرے پاس بھی، قرضہ معاف کروانے کے سلسلے میں آیا۔

آپ بخوبی واقف ہیں۔ سیاسی اثر رسوخ کی وجہ سے میں
نے بینک منیجر سے بات بھی کی اور پھر وہ میرا جان پہچان والا بھی ہے لیکن بدقسمتی سے اس
نے صاف طور پر انکار کر دیا کہ اگر اس نے، اسطرح کا کوئی فیصلہ لیا تو ستار کی برادری
کے سب لوگ بھی، بینک پر اڈ پڑینگے۔ اسطرح سے یہ معاملہ بہت الجھ جائے گا اور
پریشانی کھڑی ہو جائے گی۔

آج صبح، میں کسی ضروری کام کے سلسلے میں، گھر سے
سویرے ہی نکل گیا تھا۔ ابھی جب میں واپس گھر پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اس ستارے
نے میرے گھر پر، میری عدم موجودگی میں تین زندہ مچھلیاں، ایک بڑی اور دو چھوٹی چھوٹی
چھوڑ دی ہیں۔ گھر کے سبھی افراد میرے مزاج سے اچھی طرح سے واقف ہیں۔ ان کے
لاکھ منع کرنے کے باوجود بھی، یہ ان مچھلیوں کو وہیں چھوڑ کر فرار ہو گیا۔

گھر آتے ہی، جب مجھے اصل واقعے کا پتہ چلا۔ تو سب
سے پہلے میں نے ان تینوں مچھلیوں کو جھیلِ ڈل میں ڈلوا دیا۔ چھوٹی دو مچھلیاں فوراً بھاگ
گئیں۔ بڑی والی جب کچھ دیر تک، پانی میں بے حس و حرکت پڑی رہی۔ تو میں اسے
اٹھا کر واپس لایا ہوں۔

میں اس ستار گاڑہ ہانز سے یہ پوچھ رہا ہوں کہ اس نے کیسے جرأت کی،
میرے گھر یہ مچھلیاں لانے کی؟ آپ اس سے پوچھئے کیا میں صرف اس کی خاطر، تین بار
اس کے ساتھ بینک میں نہیں گیا؟ اور کیا میں نے متعلقہ بینک منیجر کی صرف اس کی خاطر،
منت سماجت نہیں کی؟ کہ وہ اس کا قرضہ معاف کرا دے؟۔ اور اب یہ اس بڑی والی مچھلی
کو واپس لینے سے بھی مکر رہا ہے۔۔۔؟"

راہ چلتے ہوئے کئی لوگوں نے یہ رام کہانی سن
لی۔ کچھ اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ کچھ رک بھی گئے، اور کچھ نے بات معلوم کر

کے اپنی اپنی راہ لی۔اب لے دے کے ہم پانچ پڑوسی یہاں رہ گئے تھے۔رفیع صاحب جو ایک سیاسی کارکن ہیں سماجی اور فلاحی کاموں میں شریک رہتے ہیں ان کی ایمانداری کے لئے یہی ایک ثبوت کافی ہے کہ ہر ایک کے کام آجاتے ہیں اور کسی سے کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتے اور نہ ہی کسی پر احسان جتاتے ہیں۔جس سیاسی پارٹی کے ساتھ یہ ایک عرصہ سے وابستہ ہیں وہاں ان سے بہت جونیئر لوگ بھی اپنی چاپلوسی اور چالاکی سے' ان سے بہت آگے نکل چکے ہیں اور انہوں نے کافی مال و دولت بھی جمع کر رکھی ہے اور پاس پڑوس میں ہی کیوں ہر جگہ ان کی بہت عزت کی جارہی ہے۔جبکہ رفیع صاحب وہیں کے وہیں رہے۔

ستار گاڑہ ہانز جو ایک غریب و مفلس مچھیرہ ہے۔ بینک کے چار ہزار روپئے کا قرضہ مع سود کے' ادا نہ کرسکنے کی وجہ سے اتنا پریشان ہے کہ اس کا سکون و آرام اس سے چھن گیا ہے اور یہ رفیع صاحب کے ہاں قرضہ معاف کرانے کے سلسلے میں چکر لگا رہا ہے۔

تیسرے شخص ہمارے ایک پڑوسی ہیں جو برسرِ اقتدار پارٹی کے ایک بہت بڑے عہدے دار ہیں۔اپنے سیاسی کیریئر کا آغاز ایک عام رف اینڈ ٹف ورکر سے شروع کرکے ایک بہت اونچے عہدے تک پہنچ گئے اللہ بہتر جانتا ہے۔لوگ کہہ رہے ہیں کہ یہ صاحب پارٹی کے باس کو لڑکیاں سپلائی کرتے تھے اور 'آج اپنے اسم مبارک کے ساتھ 'حاجی' کا لفظ بھی جوڑ دیتے ہیں۔

چوتھے شخص بھی اسی پارٹی کے' اور ایک قطب مینار ہیں۔جو بڑے بڑے عزت دار آفسروں کو گالیاں بکنے میں بڑے ماہر ہیں۔ہر آستانے اور ولی اللہ کے مزار و مرقد پر رشوت اور حرام کی کمائی سے چادر چڑھانے' حاضری دینے اور عرس میں بڑھ چڑھ کر شرکت کرکے اپنا نام اعتقادیوں میں لکھوانے میں پیش پیش رہتے ہیں۔نہ

جمہوریت کے قائل ہیں اور نہ خلافت کے ہی۔ خاندانی راج کے بہت بڑے حمایتی بن کر' دادا' والد' پوتے اور پڑپوتے میں لیڈر شپ کے خود بخود منتقل ہو جانے کے قائل اور حمائتی ہیں اسی لئے پارٹی کے لگ بھگ سبھی بڑے بڑے رہنماؤں کی طرح ہی' اپنے بال بچوں کو اپنا جانشین یا یوراج بنا کر کلیدی عہدوں پر بٹھا دیا ہے۔

حضرت' پانچواں شخص ------؟!' میں ہوں' ---- ہاں میں ----- ؟؟!!۔ میں اپنے بارے میں کیا عرض کروں؟۔ اپنی خامیاں آج تک کسی کو نظر آئی ہیں بھلا' مجھے آجائیں؟!۔ اور اگر نمایاں بھی ہوں تو' پھر بھی ہمیشہ' ان سے صرفِ نظر ہی کیا جاتا ہے۔ اسلئے میں معذرت کے ساتھ اپنا جانبدارانہ' یکطرفہ یا پھر بے لاگ بھی؟' تعارف کرانے سے قاصر ہوں اور خاموش رہنے میں ہی اپنی عافیت سمجھتا ہوں۔ ویسے آپ میرے بارے میں یہ گمان رکھنے میں حق بجانب ہونگے کہ میں بہت بڑا گناہگار' خطا کار اور ناکارہ بھی ہوں۔ جس کا مجھے اعتراف بھی ہے۔

بات رفیع صاحب اور ستار گاڑہ ہانز کی چل رہی تھی۔ آپ ضرور جاننا چاہتے ہونگے کہ پھر کیا ہوا؟۔ ہوا یوں کہ ہم پانچ میں سے' تینوں نے اپنی اپنی بصارت وبصیرت کے اعتبار پر' اپنی اپنی رائے اور فیصلے صادر کئے۔ لیکن کسی حتمی فیصلے پر نہ پہنچا جاسکا۔

مجھے اعتراف ہے کہ میں' --- ہاں میں ---- یہاں موجود بقیہ اشخاص سے' ظاہری طور پر اور شاید باطنی طور پر بھی ----------' سماجی اسٹیٹس اور رتبے کے لحاظ سے بہت چھوٹا ہوں۔ کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگو تیلی ----؟!۔ عمر میں بڑا ہوں تو ہوں۔ اسے کون دیکھتا--- ہے؟۔ ظاہری چمک دمک ہی سب لوگوں کو متاثر اور چکا چوند کر دیتی ہے۔ باطنی تو ------ بعد کی بات ہے؟۔

میری بات پر' بالآخر سب لوگ متفق ہو گئے۔ میں نے رفیع صاحب کے

ہاتھ سے لگ بھگ ایک کلووزن کی مچھلی لے کر'اس کی مناسب قیمت حاجی صاحب سے لے لی اور ستار مچھیرے کو دے کر' اسے گھر کی طرف رخصت کروا دیا۔ اسطرح سے یہ قضیہ ختم ہو گیا اور ہم پانچوں کی پریشانی دور ہو گئی اور ہم نے اپنے اپنے گھروں کی راہ لے لی۔

معاملہ یہیں پہ ختم نہیں ہوا۔ ہفتہ دس دن بعد صبح سویرے کسی نے میرے گھر کے دروازے پر دستک دینے شروع کر دئے۔ سردیوں کے ایام تھے ۔سورج طلوع ہونے سے قبل سردی کچھ زیادہ ہی محسوس ہوتی ہے اور کمرے سے باہر نکلنا بارِ گراں سا لگتا ہے۔ اتنی صبح صبح آنے والا بھی تو کسی خاص مقصد کے لئے ہی آیا ہوگا اور اتنی سردی میں گھر سے نکلا ہوگا۔ یہ سوچ کر میں فوراً ہی دروازہ کی طرف لپکا۔

جونہی میں نے دروازہ کھولا تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ دروازے پر، ایک ہفتہ پہلے سڑک پر ملنے والا' میلے کچیلے' کٹے پھٹے کپڑوں میں ملبوس، سردی کے موسم میں بھی پرانے اور نا قابلِ استعمال چپل پہنا ہوا' ننگے سر ستار گاڑہ ہانز تھا۔ جس کے ہاتھ میں زندہ مچھلیوں کا ایک تر بتر تھیلا بھی تھا۔ جس میں مچھلیاں محوِ حرکت تھیں۔

میرے پاؤں تلے زمیں کھسک گئی۔ میں نے اس سے میرے ہاں اسطرح سویرے سویرے آنے کا سبب پوچھا تو وہ اپنی آنکھیں نیچے کئے ہوئے دھیمی دھیمی' قدرے روہانسی آواز میں' مجھ سے یوں مخاطب ہو گیا۔

''خواجہ صاحب' کل وہ بینک والے میری جھونپڑی میں پھر آئے تھے۔ انہوں نے ایک پرچہ میرے ہاتھوں میں تھما دیا۔ وہ پرچہ میرے ساتھ' میری جیب میں ہے۔ میں بہت گھبرا گیا کہ شاید مجھے میرے جھونپڑے سے بے دخل کرنے آئے ہیں یا پھر کوئی کورٹ کچہری کا معاملہ ہوگا۔ لیکن جب میں نے انتہائی گھبراہٹ کے عالم میں' بینک کے کارندے سے' اس کاغذ کے بارے میں پوچھا تو اس نے کاغذ ہاتھ میں لے کر مجھے سمجھایا کہ کسی نے میری طرف سے چار ہزار تین سو بیالیس روپئے یکمشت بینک

میں جمع کر کے، میرا سارا قرضہ چکتا کر دیا ہے اور مجھے حرام خوری اور گناہوں سے نجات دلادی۔''

ستآر گاڑہ ہانز کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ بات کرتے وقت 'الفاظ جیسے اس کے حلق سے اٹک اٹک کر باہر آرہے تھے۔ یہ سب کہنے کے بعد اس نے اپنا مچھلیوں کا تھیلا میرے سامنے رکھ دیا اور خود آنکھیں پونچھتے ہوئے جانے لگا۔

میں بھی اپنی بھیگی ہوئی آنکھوں سے' اُسے گھور رہا تھا اور یہ فیصلہ ہی نہیں کر پا رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے ؟!۔ رفیؔع صاحب کی طرح ہی ستآر گاڑہ ہانز کو گریباں سے پکڑ کر چوراہے پر گھسیٹ کر لے جانا چاہئے؟ یا پھر زندہ مچھلیوں کو جھیل ڈل میں بھاگنے کے لئے واپس چھوڑ دینا چاہئے؟۔ اور اگر ان میں سے کوئی بے حس و حرکت ہوئی تو۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟؟!!۔

کہیں ستآر چلتی گاڑی کے نیچے آنے کی دھمکی نہ دے' اسلئے میں ڈانٹ ڈپٹ کر اسے یہ مچھلیاں واپس لے جانے پر مجبور کرنے سے بھی بے بس ولاچار تھا ؟؟!!۔



سیلاب

ہر جانب ہو کا عالم ہے۔ ہر آنکھ رو رہی ہے اور ہر دل ماتم کناں ہے۔ شدید سیلاب کے ریلے نے شہر کے ایک ایک علاقے، گلی محلے، گھر اور میدان کو، لگ بھگ دو منزل تک پانی سے بھر دیا ہے۔ بچوں اور نوجوانوں کی تو بات ہی نہیں ہے؟ بڑے بوڑھوں اور تجربہ کار بزرگوں تک کو یہ امید نہ تھی کہ پورا شہر اسطرح کے تباہ کن سیلاب سے، بری طرح سے، وہ بھی آناً فاناً، متاثر ہوگا اور پلک جھپکتے ہی، دس بیس فٹ تک پانی میں تیرنے لگے گا اور نہ کوئی حکومتی ادارہ ہی پیشگی اطلاع دے گا اور نہ کوئی موسمیاتی سٹلائٹ ہی اس آفاتِ سماوی کی، قبل از وقت اطلاع فراہم کر پائے گا، تا کہ اس قہر سے بچا جا سکتا۔

سب کچھ اچانک اور دفعتاً ہو گیا۔ کسی کو کوئی خبر نہ ہوئی۔ بچے، بیمار، عورتیں اور بوڑھے سب اپنے اپنے گھروں میں بے فکر ہو کر معمول کی طرح

ہی اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے اور اطمنان سے بیٹھے ہوئے تھے اور پھر بستیوں میں سیلاب کا خونخوار ریلا' دن میں نہیں' رات کے اندھیرے میں گھسنا شروع ہو گیا کہ افرا تفری کے عالم میں لوگ حواس باختہ ہو کر انجانی سمتوں کی طرف بھاگنے دوڑنے لگے۔

پانی کا بہاو اتنا ڈراؤنا اور تیز تھا کہ کسی کو اپنے آپ تک کو بچانے کی ذرا سی مہلت تک نہ ملی دوسرے انسانوں یا پھر گھر کے سازوسامان کی بات تو الگ ہے کسی دوسرے کو بچانے کی مہم جوئی کی بات ہی پیدا نہیں ہوتی۔ میں نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ میں اپنے تین منزلہ مکان کی اوپری منزل میں بیٹھ کر کسی مدد کا انتظار کروں دو منزلیں مکمل طور پر پانی سے بھر گئی تھیں۔

جواہر نگر میں لین نمبر ایک کی نکڑ پر' فرنٹ پر میرا مکان واقع ہے اور میں دو دن سے یہاں اکیلے رہ رہا ہوں۔ گھر کے دیگر افراد' اور ایک جگہ پر' ایک قریبی رشتہ دار کی شادی میں' شرکت کے لئے گئے ہوئے ہیں۔ شادیوں کا سیزن عروج پر ہے اور اکثر شہر کے پوش علاقہ جات میں چوریوں کی رپورٹیں آتی ہی رہتی ہیں اسلئے گھر' خاص طور پر راتوں کو' خالی نہیں چھوڑنے پڑتے۔

بارشوں کا قہر تھم تو گیا ہے لیکن جہلم میں سطح آب ابھی بڑھ رہی ہے اور پانی کی سطح کو ماپنے کے لئے کل رات' مکان کی دیوار پر لگایا ہوا نشان بتا رہا ہے کہ سیلابی ریلے کی سطح ابھی تک اونچی ہو رہی ہے۔

رات کیسے اور کس طرح' گھپ اندھیرے میں' دہشت اور خوف و انتشار میں گزر گئی؟ بس میں اور میرا خدا جانتا ہے؟۔ کبھی عورتوں اور بچوں کی چیخ و پکار سے فضاء میں ارتعاش سا پیدا' ہو جاتا تھا؟ تو کبھی مردوں کے زور زور سے مدد کے لئے بے سود چیخنے چلانے سے' یا پھر کسی مکان کے ڈہ جانے کی لرزہ خیز آواز سے۔

جوں توں کر کے صبح نمودار ہو گئی اور ذرا سا اطمنان ہونے لگا

کہ شاید کوئی رسکیو ٹیم مجھے بھی میرے گھر سے ڈھونڈھ نکالے گی اور کوئی کشتی میرے مکان کی تیسری منزل کے' دالان پر رک کر' مجھے سوار کردے گی یا پھر آئر فورس کا کوئی ہیلیکاپٹر مکان کی چھت سے اوپر' مجھے کھینچنے کے لئے رسی پھینک دے گا۔

میرا گھر فرنٹ پر ہے اور یہیں سے لین نمبر۔ ا' کا آغاز ہوتا ہے گھر کے بالکل سامنے ذرا سی دوری پر دریائے جہلم بہتا ہے۔ دریائے جہلم اور میرے گھر کے درمیان ایک کشادہ سڑک ہے اور دریا کا اونچا باندھ' میرے مکان کی چھت سے ذرا نیچے ہے۔

کئی دنوں کی مسلسل اور متواتر بارشوں کے قہر سے' لگ بھگ ایک ہفتے سے دریائے جہلم کی سطح آب بڑھ رہی تھی اور یہ خطرے کے نشان سے تقریباً دس بارہ فٹ اونچی ہوگئی۔ سب لوگ خوابِ خرگوش میں پڑے ہوئے تھے۔ حکومت کچھ زیادہ ہی' کہ اس سٹلائٹ ٹکنالوجی کے دور میں بھی' کوئی چتاونی یا وارننگ جاری نہ کرسکی تا کہ لوگ محفوظ مقامات کی طرف رخ کر لیتے اور پھر مقامی لوگ بھی اسطرح کے شدید اور ناقابل یقیں سیلابوں کی آمد کو اب' بالکل بھول چکے ہیں کہ پچھلی ایک صدی سے بھی زیادہ عرصہ سے اس طرح کی حالت سے' دوچار نہیں ہوئے ہیں۔ اکثر لوگ معمول کی طرح ہی اپنے گھروں میں چین و اطمنان سے پڑے تھے کسی کو اس ابتر اور پریشان کن حالت کا کوئی اندیشہ تھا نہ ہی کوئی اندازہ یا فکر و تردد ہی۔

مجھے میری بیوی بچوں کی کوئی پریشانی لاحق نہیں تھی۔ وہ جہاں مقیم تھے وہ ایک بالائی علاقہ ہے جہاں سیلاب کا کوئی خطرہ نہیں رہتا۔ ہاں البتہ کل سے موبائل نٹ ورک کے مکمل فیل ہو جانے' ریڈیو اور ٹی وی اسٹیشنوں میں پانی گھس جانے' نشریات کے رک جانے وغیرہ سے' باہمی روابط مکمل طور پر منقطع ہو چکے ہیں اسلئے میرے گھر والوں کو' میرے بارے میں انتہائی پریشانی لاحق ہوگی۔ ایسے مواقع پر افواہیں بھی بہت پھیلتی ہیں جو انسان کو اور بھی پریشان کر دیتی ہیں۔ زینب کے بارے میں انہیں اور

زیادہ پریشانی ہوگی جوکئی دنوں سے اکیلی گھر پر رہتی ہے۔زینب میری چھوٹی بہن ہے چار پانچ سال قبل اس کی شادی ہمارے پڑوس میں ہمارے گھر سے آگے لین نمبر۔۱۱ میں رہنے والے ہمارے پھوپھا زاد بھائی انور سے ہوئی ہے۔کل شام میں زینب کے ہاں شام کا کھانا کھا کر رات گزارنے کے لئے اپنے گھر آیا ہوا ہوں زینب اپنے تین چار سال کے بیٹے قیصر کے ساتھ اکیلی رہ رہی ہے۔اس کے میاں بینک منیجر ہیں۔حال ہی میں ریاست سے باہر ان کا ٹرانسفر ہوا ہے۔وہاں جوئن کرنے کے لئے جاچکا ہے۔بندوبست ہوجانے پر اپنی فیملی کو بھی ساتھ لے جائیگا۔

اتنی پریشانیوں کے باوجود بھی مجھے سب سے زیادہ زینب اور قیصر کی فکر و پریشانی بے قرار کررہی ہے۔پتہ نہیں اکیلے کیا کر رہے ہونگے اور کہاں پر ہونگے؟۔اس طرح کی لاچاری اور بے بسی میں کوئی کرے تو کیا کرے؟ باہمی رابطہ کٹا ہوا ہے ورنہ پل پل کی خبر رہتی۔

میں تیسری منزل پر بنی سلیب پر پانی کی سطح پر مسلسل اپنی نظریں گاڑھے ہوئے ہوں۔کبھی کوئی گائے، زندگی کی کشمکش میں مبتلا سیلابی ریلے کے ساتھ بہے جارہی ہے توکبھی کوئی بھیڑ، کبھی کوئی مرغا پر پھڑپھڑاتے، چیختے چلاتے ہوئے بہہ رہا ہے تو کبھی کوئی پریشر کوکر، کرسی یا کارتنک وغیرہ۔

دور سے ایک ادھیڑ عمر کے شخص کی لاش دیکھکر میں سہم گیا۔میں نے ڈرتے ہوئے، بڑی پھرتی کے ساتھ پاس ہی رکھی ہوئی لکڑی سے اسے قریب لاکر سامنے پڑی ہوئی رسی سے پاوں سے باندھ کر اپنے مکان کے دالان پر سیمنٹ کی بنی ہوئی جالی سے کس کر باندھ دیا۔دوسرے ہی لمحے ایک پانچ سات سال کے بچے کی لاش بھی بہتی ہوئی دکھائی دی، اشکوں کے سیلاب کے ساتھ ہمت اور حوصلے سے اسے بھی ایسے ہی باندھ دیا پھر ایک عمر رسیدہ شخص کی لاش۔-------پھر ایک نوجوان کی

لاش۔۔۔۔۔۔پھر ایک اور لاش۔۔۔۔۔۔؟ ان میں کچھ میرے پڑوسی' بھی ہیں۔
جن کے چہروں کو میں پہچان بھی لیتا ہوں۔ ارادہ یہ ہے کہ سیلاب کا زور کچھ کم ہوتے ہی'
ان کے ورثاء کو بلا کر' انہیں ان کے سپرد کردوں اور اگر یہ بہت دور چلی گئیں تو ان کی
شناخت بھی مشکل ہو جائیگی اور انہیں لاوارث سمجھ کر کہیں پر بھی دفنا دیا جائے گا یا پھر کسی اور
طرح سے یہ ٹھکانے لگ جائیں گی۔

بہت دن ہو گئے۔ جھیل ڈل کے کنارے پر رہنے والے غلام حسن
سے سنا تھا کہ ان کے پڑوس میں' کوئی دوشیزہ جھیل ڈل میں مویشیوں کے لئے چارہ جمع
کرتی ہوئی اپنی چھوٹی سی نیا کے سرے پر بیٹھی ہوئی تھی کہ اچانک کشتی میں ذرا سی ہلچل
سے توازن بگڑ جانے سے وہ منہ کے بل گہرے سیلابی پانی میں گر گئی۔ چونکہ پاس پڑوس
میں اسے بچانے والا اور کوئی نہیں تھا اسلئے وہ ڈوب کر مر گئی پھر کچھ وقفے کے بعد اس
کی لاش سطح آب پر نمودار ہو گئی کہ وہاں سے گزرنے والی ایک کشتی میں جانے والے کسی
شخص کی نظر اس پر پڑی کنارے پر اطلاع کرتے ہی اس کے ورثاء اس کی طرف
دوڑنے لگے۔ غلام حسن بھی ان لوگوں میں شامل تھا۔ جو یہ بتا رہا تھا کہ جب تک انسان
پانی میں زندہ ہوتا ہے تو پانی اسے اوپر نہیں جانے دیتا اور جب وہ مر جاتا ہے تو اسے اوپر
پھینک دیتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ڈوب کر مرنے والی عورت کا چہرہ' ہمیشہ نیچے کی
طرف چھپا رہتا ہے کہ پانی بھی اس کا پردہ کرتا ہے اس کا ستر ڈھانپ لیتا ہے اور اسے
ہرگز بے پردہ نہیں کرتا؟۔

غلام حسن کی ان باتوں میں کونسی منطق پوشیدہ تھی۔ یا پھر ان کا کوئی
سائنسی پس منظر بھی تھا یا نہیں؟ یہ سب وہ جانے' میں یہ جانتا ہوں کہ اسی دوراں دریائے
جہلم کے خونخوار سیلابی ریلے نے میرے سامنے اور ایک لاش پٹک دی یہ ایک نوجوان
عورت کی لاش تھی۔ جس کا منہ واقعی نیچے کی طرف چھپا ہوا تھا اور اس کی کمر پر سکارف بندھا

ہوا تھا۔ جب میں نے ہمت کر کے اس عورت کا پیر پکڑ کر اس کی ٹانگ میں رسی باندھ لی اور اسے اپنے دالان پر سیمنٹ کی جالی سے باندھا تو نہ جانے میرے دل میں یہ خواہش یہ حسرت سی کیوں کر پیدا ہوگئی کہ میں دیکھوں، کہ اس جوان عورت کی کمر پر سکارف سے کیا چیز، نیچے کی طرف بندھی ہوئی ہے؟ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے قریب لا کر، کپڑوں سے پکڑ کر پلٹنا شروع کر دیا۔۔۔۔۔۔۔۔جب میں نے اسے پلٹا۔۔۔۔۔۔اور اس کا چہرہ میری بصارتوں سے۔۔۔۔۔۔۔۔ٹکرا گیا۔۔۔۔۔۔تو کیا دیکھتا ہوں؟ کہ۔۔۔۔۔۔۔۔یہ چہرہ۔۔۔۔۔۔۔میری بہن۔۔۔۔۔۔۔زینب کا چہرہ ہے؟۔ اور اس کی چھاتی کے ساتھ۔۔۔۔۔۔۔۔اس کا تین سال کا بیٹا۔۔۔۔۔۔۔میرا بھانجا۔۔۔۔۔۔قیصر بندھا ہوا ہے؟؟۔

دیر سویر جہلم کے سیلاب کا یہ خونخوار ریلا گزر ہی جائے گا؟ اور سطح آب بھی اپنی معمول کی لیول پر آئیگی؟ لیکن نہ جانے، میری آنکھوں سے مسلسل اور متواتر بہنے والا یہ سیلاب کا ریلا۔۔۔۔کبھی اتر بھی جائے گا یا نہیں؟؟؟



گھر گرہستی

میری اچھی سہیلی اور بہت پیاری بہن، آمنہ

السلام علیکم

ایک عرصہ کے بعد اپنے نام، میرا یہ خط دیکھ کر حیران ہو گئی ہو گی۔ آج کے اس ای میل اور ایس ایم ایس کے دور میں کچھ زیادہ ہی۔ لیکن کیا کروں میرے پاس نہ تمہارا ای میل آئی ڈی ہی ہے اور نہ تمہارا موبائل نمبر ہی۔

تعلقات میں اتنے لمبے عرصہ کی دوری اور باہمی روابط میں تساہل کی ساری زمہ داری میں اپنے سر لیتی ہوں۔ میں اپنے کئے پر نادم بھی ہوں اور شرمندہ بھی۔ ملازمت کے دوراں مختلف کلیدی عہدوں پر فائز رہنے اور اپنی منصبی زمہ داریوں اور کچھ اپنی تساہل پسندی نے مجھے اپنوں سے دور کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ میں آج تم سے اتنی دور ہو گئی ہوں۔ ورنہ ان دنوں کی یادیں، جب ہم ایک جان دو قالب تھے، آج بھی میرے ذہن و دل میں تروتازہ ہیں اور مرتے دم تک یاد رہیں گیں۔

غلط فیصلے بھی انسانوں سے ہی ہوا کرتے ہیں۔ کوئی بھی انسان
'زندگی کے اہم فیصلے بہت سوچ سمجھ کر کرتا ہے۔ لیکن پھر بھی اپنے جذبات واحساسات
کے ہاتھوں کبھی کبھار' پھونک پھونک کر' قدم رکھنے والا شخص بھی' میری طرح ہی تھک ہار
کر' سب کچھ اپنے مقدر پر ڈال دیتا ہے اور ہر پیش آنے والے حادثے کو' خاموشی کے
ساتھ' تنہا ہی سہہ لیتا ہے اور اف تک نہیں کرتا۔ بہت کم لوگ' میری طرح' ہر ہونی انہونی
اور سنجیدہ سے سنجیدہ مسئلے کو بھی' تب تک خاموشی کے ساتھ اکیلے ہی سہنے اور بھگتنے کے عادی
ہوتے ہیں جب تک نہ بات ان کی برداشت سے باہر ہو جائے اور سیلاب کا پانی کناروں
کو پھلانگتا ہوا اوپر سے بہنے نہ لگ جائے۔

زندگی کے یہ سیٹھ سال ایسے ہی گزر گئے۔ بچپن' والدین اور اکلوتی
بہن کے ساتھ اطمنان کے ساتھ گزر گیا۔ جوانی اچھی نوکری کی خواہش میں' اعلیٰ تعلیم کے
حصول میں' پھر اچھی نوکری کا خواب بھی شرمندۂ تعبیر ہو گیا۔ دن رات کی مصروفیات اور حد
سے زیادہ زمہ داریوں نے اسطرح گھیرے رکھا کہ پتہ ہی نہیں چلا کہ جوانی کیسے وارد
ہو کر رخصت بھی ہو گئی۔ خود اپنی زندگی کے اہم اور انتہائی حساس معاملات پر توجہ مرکوز
کرنے اور ان پر غور وخوض کرنے کی فرصت اور مہلت نہ ملی۔ اپنی زندگی تک کو سنوارنے
سدھارنے اور اسے ایک اچھی سمت دینے سے بھی رہ گئی۔

زندگی نے کچھ کڑوی سچائیاں میرے سامنے رکھ دیں۔ جن میں ایک
سچائی' جس پر تم ہمیشہ بضد رہا کرتی تھی اور جس پر تم نے عمل بھی کر دکھایا کہ' اگر گھر گرہتی
سنبھالنی ہو تو اعلیٰ تعلیم کے پیچھے مت بھاگو؟ جسے حاصل کرتے کرتے جوانی بھینٹ چڑھ
جاتی ہے پھر گھر گرہستی ایک خواب بن کر رہ جاتی ہے۔ بالکل ویسے ہی' جیسے میرے ساتھ
ہوا اور ہو رہا ہے۔ یا یوں کہو میں اپنے ہی کئے کی سزا بھگت رہی ہوں۔

میرے ساتھ کیا ہوا؟ کیسے ہوا؟ اور کیوں ہوا؟ پڑھنا چاہتی ہو تو میں

لکھ دیتی ہوں اور اگر پڑھنا نہیں بھی چاہتی ہو تو؟ میں پھر بھی لکھے دیتی ہوں کہ میں اپنے سینے پر پڑے ہوئے اس نا قابلِ برداشت بوجھ کو زرا سا ہلکا کر دینا چاہتی ہوں۔

ریٹائرمنٹ کے بعد' میں اپنے گھر کیا' مکان کہہ لیجئے؟ میں اکیلے رہتی ہوں۔آج نہ عہدے کی زمہ داریاں ہی ہیں اور نہ ہر وقت گھیرے رکھنے والی چاپلوسوں کی فوج؟۔زندگی سے متعلق' خود اپنے لئے ہوئے فیصلے ہی' ڈرانے لگتے ہیں۔جن کے ممکنہ انجام کا تصور تک خوفناک ہے شاید اسی لئے کچھ زیادہ ہی فکرمند ہوں۔اتنا فکرمند جتنا مجھے پچیس تیس سال کی عمر میں ہونا چاہئے تھا۔جب میں اپنی پڑھائی اور سوشل اسٹیٹس کے بارے میں' حد سے زیادہ پریشان تھی۔آج ایک اچھا سوشل اسٹیٹس اور ایک اچھا اور کشادہ مکان ہے جسے گھر نہیں کہا جا سکتا؟ اور گرہستی۔؟

تم نے شاید سنا ہوگا۔میں نے اپنے سے کم عمر کے' اپنے ایک ماتحت سے شادی بھی کر لی تھی۔شادی شدہ زندگی کے کچھ سال ٹھیک ہی گزر گئے۔پھر وہی ہوا جو اس طرح کی شادیوں کا ہوتا ہے۔شوہر سے اونچے سوشل اسٹیٹس والی بیوی' اپنے اسٹیٹس کو دیکھتی ہے اور بیوی سے پست اسٹیٹس والا شوہر ہمیشہ احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتا ہے کہ ساتھ ساتھ چلنے' ازدواجی رشتہ نبھانے اور ایک دوسرے کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرنے کا جذبہ' دونوں کی قوتِ برداشت کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔قوتِ برداشت ہو تو ایک دوسرے کو سہنے اور برداشت کرنے کے' ہزار مواقع نکل آتے ہیں اور اگر یہ صرف ایک میں موجود ہو تو' جوں توں کر کے رشتہ قائم رہ سکتا ہے مگر بس رشتہ نبھانے کی حد تک' اور اگر دونوں میں قوتِ برداشت نہ ہو تو فوراً ہی راستے الگ الگ ہو جاتے ہیں۔

آمنہ میری بہن' خط بہت طویل ہو گیا۔جواب آ گیا تو باقی پھر کبھی؟

اپنے اور اپنی گھر گرہستی کے بارے میں تفصیل کے ساتھ بتانا۔سننا بہت اچھا لگتا ہے۔اگر مناسب سمجھو تو اپنا ای میل آئی ڈی اور موبائل نمبر بھی لکھ دینا' میں دونوں لکھ

دیتی ہوں۔

والسلام

تمہاری بہن

رخسانہ''

آمنہ کے پوسٹل ایڈرس پر خط پوسٹ کرنے کے پورے دس دن بعد میرے موبائل کی گھنٹی بجی۔ ایک نامانوس اور Un-Save نمبر سے کسی کی کال آئی۔ بٹن دباتے ہی کسی نسوانی آواز کے ساتھ بلا تکلف اور اپنائیت بھرے لہجے میں سلام ودعا کے بعد، گلے شکوے ہونے لگے اور پھر آمنہ کے ساتھ یوں مکالمہ شروع ہونے لگا۔ آمنہ پوچھنے لگی؟

''خط میں تم کچھ زیادہ ہی فلسفی بن گئی ہو مطلب کی بات کرو۔۔۔ پھر، کیا ہوا؟''

''ہونا کیا تھا؟ ہمارے راستے الگ الگ ہو گئے؟''

'' اچھا۔۔۔؟ ڈائیوورس ہو گیا۔۔۔۔؟''

''ہاں۔۔۔۔۔۔، کئی سال ہو گئے۔''

''وجہ۔۔۔۔۔؟''

''خط میں لکھ چکی ہوں۔ وہی دونوں میں قوتِ برداشت کی کمی۔۔۔۔۔۔''

''تم اکیلے ہی اپنے گھر میں رہ رہی ہو؟۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور وہ۔۔۔؟''

''گھر میں نہیں، اپنے مکان میں اکیلی رہ رہی ہوں؟ اس نے فوراً ہی دوسری شادی کر لی۔۔۔۔۔، میں اسے کوئی بچہ بھی نہیں دے سکی تھی۔ آج وہ دو تین بچوں کا باپ بھی ہے۔۔۔۔۔؟''

''اس کے لئے کئی آپشن کھلے تھے، جوان تھا، برسرِ روزگار تھا، آگے بڑھنے کے چانسز بھی تھے اور گھر گرہتی۔۔۔۔۔۔۔۔؟؟؟''

"ٹھیک کہتی ہو آمنہ ۔۔۔۔؟ میرے لئے کوئی آپشن نہیں تھا۔۔۔۔۔۔؟ عمر ڈھل چکی تھی ۔۔۔؟ ملازمت مکمل ہونے والی تھی ۔۔۔؟ اور گھر گرہستی ۔۔۔۔۔۔۔؟؟"

"تم نے دوسری شادی کے بارے میں کیوں نہیں سوچا ۔۔۔۔۔۔؟"

"اب کافی دیر ہو چکی تھی ۔ میں اسطرح کا تجربہ دہرانا نہیں چاہتی تھی اور اگر اس کا انجام بھی پہلی شادی جیسا ہی ہوتا ۔۔۔؟ تو پھر کیا ہوتا ۔۔۔؟ اب نہ میرے پاس جوانی ہی تھی، نہ ملازمت ہی اور نہ گھر گرہستی کی کوئی امید یا آس ہی ۔۔۔۔۔۔؟ اور پھر میری عمر کے سب لوگ شادی شدہ اور گھر گرہستی والے تھے ۔۔۔۔۔؟"

"میں تمہاری بچپن کی سہیلی ہوں ۔ تم نے آج تک مجھے اس ضمن میں کچھ نہیں بتایا؟ بتاتی بھی کیسے؟ نہ رابطہ ہی تھا اور نہ تعلق ہی ۔ بتایا ہوتا تو شاید میں ایسی نوبت نہ آنے دیتی اور شاید تمہارے لئے کچھ کر بھی پاتی ؟"

"میں نے کہا نا، میں تب تک اپنی پریشانی، اپنے غموں کو اکیلے سہنے کی کوشش کرتی ہوں جب تک میں تنہا اپنا بوجھ اٹھانے کے قابل ہوتی ہوں!۔"

"آج کونسا جذبہ، کونسا احساس، تمہیں مجھ کو، یہ سب لکھنے اور بتانے پر مجبور کر رہا ہے؟۔"

"سیٹھ پینسٹھ سال کی عمر ۔۔۔۔۔۔۔؟؟ اپنے بڑے، سجے سنورے اور ہائی فائی گھر میں تنہا اور اکیلے رہنے والی، مطلقہ عورت کے جذبات و احساسات ۔۔۔۔؟ ہر لمحہ اور ہر پل، قریب سے قریب تر ہونے والے، زندگی کے انجام کا خوف ۔۔۔۔۔۔؟ اور سب سے بڑھ کر احساس تنہائی ۔۔۔۔۔۔۔؟ جو بری طرح سے میرے اعصاب پر اسطرح سے چھایا ہوا ہے کہ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ اس سے اب مفر ممکن نہیں ہے؟"

"معاف کرنا ۔۔۔۔، میری بچپن کی اچھی سہیلی ۔۔۔۔، میری بہن ۔۔۔۔ رخسانہ ۔۔۔؟ میں سیٹھ پینسٹھ سال کا کوئی اکیلا اور مجرد مرد نہیں ہوں؟، تم جیسی ہی، تمہاری عمر کی ایک عورت ہوں ۔ تم سے کیا چھپانا؟ میرا سوشل اسٹیٹس

ایک گھریلو عورت کا اسٹیٹس ہے میں گھر گرہستی والی تمہاری سہیلی آمنہ ہوں۔۔۔۔؟ تم بتاؤ، تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟۔''

''کچھ نہیں'۔۔۔ میری اچھی سہیلی آمنہ؟ میں صرف تم سے گلے ملکر رونا چاہتی ہوں'۔۔۔۔۔۔ اور میری بہن۔۔۔۔۔ تمہیں چومنا چاہتی ہوں' کہ تمہاری سوچ کتنی درست تھی اور میری کتنی غلط اور بے کار۔۔۔۔۔۔۔؟؟''

''کون سی سوچ۔۔۔۔؟ تم کس سوچ کی بات کرتی ہو؟''

''اسی سوچ کی کہ ''سوشل اسٹیٹس اور گھر گرہستی دو متضاد چیزیں ہیں اگر ایک کے پیچھے بھاگو گی تو دوسری ہاتھ سے جائیگی' کیونکہ پرانی کہاوت ہے کہ دو مچھلیاں ایک ہاتھ میں نہیں آتی ہیں یا سما سکتی ہیں؟''

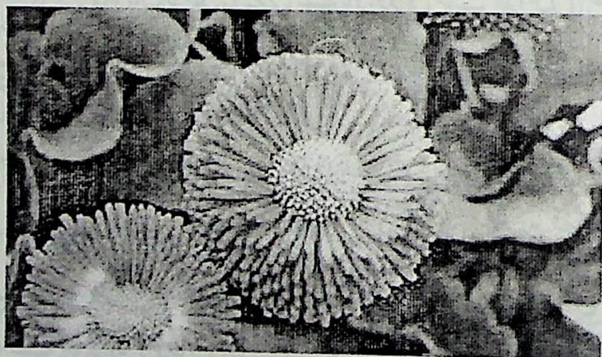
''آج تم کس نتیجے پر پہونچ گئی ہو؟''

''اس نتیجے پر۔۔۔' کہ تم کتنا سچ کہہ رہی تھی'۔۔۔۔۔۔ تمہارا۔۔۔۔ ایک ایک لفظ۔۔۔ سچ تھا۔۔۔۔ سچ کے سوا۔۔۔۔۔۔۔۔ کچھ بھی نہیں تھا۔''

''اللہ کا شکر ہے کہ تم میری باتوں اور میرے ذاتی فیصلے کی تصدیق کر رہی ہو اور میرے فیصلے کو درست بھی مان رہی ہو' لیکن میری بہت اچھی بہن' کیا تمہیں ایسا نہیں لگ رہا ہے کہ تم نے اسے تسلیم کرنے میں بہت دیر لگا دی؟''

''ہاں آمنہ' پورے چالیس سال' وہ بھی بہت کچھ کھو کر؟ تب یہ بات مان لی ہوتی؟ تو آج میرے پاس بھی تمہاری طرح ہی' ہاوس وائف کا سوشل اسٹیٹس' بھرا پرا گھر' ہنستے کھیلتے بچے'۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ 'وہ'۔۔۔۔؟؟ اور وہ سب کچھ ہوتا' جس کی اس عمر میں' اس مقام پر' ضرورت ہوتی ہے یا ضرورت پڑتی ہے۔ سب سے بڑھ کر میرا' بلکہ' ہم سب کا 'گھر' ہاں ہاں گھر' ہمارے پاس ہوتا؟ یہ خالی خولی مکان' اور اس مکان میں اکیلے پن کا' ہر لمحہ چبھتا ہوا احساس' اور اپنے انجام اور اپنے مستقبل کا خوف اور ڈر' نہیں ہوتا؟''

اس کے بعد مکالمہ منقطع ہوگیا' جاری نہ رہ سکا۔ پتہ نہیں لائن خود ہی کٹ گئی یا پھر۔۔۔۔۔کاٹ۔۔۔۔دی گئی؟ میں کچھ دیر تک انتظار میں رہی شاید پھر گھنٹی بج جائیگی جو نہیں بجی۔ میں نے آمنہ کا موبائل نمبر Save تو کر دیا لیکن اسے Dial کرنے کی ہمت' جٹا نہ پائی۔





تابوت

دنیا میں لاکھ برائیوں کے باوجود بھی نیک، خداترس، مخیر اور مخلص لوگوں کی کوئی کمی نہیں ہے اور اس طرح کے لوگ ہر دور میں موجود رہتے ہیں اور اگر نہ ہوتے تو دنیا کب کی ختم ہو چکی ہوتی کہ بدی کا اثر زائل کرنے کے لئے، نیکی کا وجود نا گزیر ہے۔

ہر طرح محشر سا بپا تھا۔ شہر خاص اور اس سے ملحق علاقوں میں لگ بھگ ایک منزل تک سیلاب کا پانی گھس چکا تھا۔ اچانک اور غیر متوقع آفاتِ سماوی سے لوگ گھروں میں قید ہو کر رہ گئے تھے اور اپنے صحنوں اور کمروں میں سیلابی ریلے کو دیکھ کر سازو سامان سمیٹے بنا ہی اپنی جان بچانے کے لئے فوراً اپنے یا پاس پڑوس کے اونچے مکانوں کی چھتوں پر آ گئے تھے۔ یہ آفت دن میں آتی تو کچھ کیا جا سکتا تھا لیکن رات کے اندھیرے میں زیادہ سے زیادہ افرادِ خانہ کو ہی بچانا ممکن تھا اور کچھ بھی نہیں۔

سیلابی ریلا ابھی نشیبی علاقوں میں بہت تیز رفتار اور بہاو سے جا رہا تھا۔ اسلئے بیچ میں آنے والی ہر ایک چیز کو بہا کر لے جاتا تھا۔ چاروں طرف کہرام سا مچا ہوا تھا۔ لوگ انسانی جانوں کو بچانے میں لگے ہوئے تھے۔ ہر سمت چیخ و پکار

اور شور شرابا تھا۔

رونے، سسکنے اور ماتم کرنے کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں اور بیچ بیچ میں مکانوں اور دیواروں کے ڈھ جانے کی خوف ناک صداؤں سے لرزہ سا طاری ہو جاتا تھا۔ بجلی ، پانی، ریڈیو، ٹی وی، موبائل اور اسطرح کے سارے سسٹم بیٹھے ہوئے اور بیکار تھے۔ اسلئے کسی کو کسی کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں تھا۔ بارش ابھی تک ہو رہی تھی اسلئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ یہ قیامتِ صغریٰ ابھی قائم رہ سکتی ہے۔

لوگوں کی کثیر تعداد رشوت خور، بد دیانت اور نا قابل و نا اہل حکمرانوں سے خائف تھی اسلئے کسی عملی مدد یا تعاون کے بجائے، صرف زبانی جمع خرچ اور دکھاوے کے واویلا کی توقع رکھنے میں حق بجانب تھے کیونکہ اقتدار کی ہوس، ذاتی اغراض و مقاصد کی تکمیل، تکبر و غرور کی موجودگی، منافقت اور سیاسی پینترہ بازی سے سیدھے سادھے عوام کا استحصال، کذب بیانی اور الزام تراشی سے اپنے مدِ مقابل پر سبقت لیجانے کی دوڑ، اور دیگر قبیح اعمال و افعال نے اہلِ سیاست کے دل کالے اور نظر ناپاک بنا دی تھی۔ ایسے حاکموں سے بھلا کیا امید یا توقع کی جاسکتی تھی؟۔

اب سارے شہر کے نشیبی علاقوں میں پانی مکمل طور پر بھر چکا تھا اور دو دن میں دریائے جہلم کے طوفانی ریلے نے سارے شہر کو سمندر میں تبدیل کر دیا تھا۔ اونچے اونچے مکانوں کی چھتیں اور ان مکانوں پر امداد کی اپیل میں، اپنے ہاتھ بلند کرنے والے لوگ ہی، ہر طرف دکھائی دے رہے تھے۔ جو کئی دنوں سے بھوکے پیاسے، خوف و انتشار اور فکر و تردد میں وقت گزار رہے تھے اور کسی غیبی امداد کی آس لگائے ہوئے تھے۔

اوپر آسمان میں ہیلیکاپٹر کبھی کبھی دوڑتے بھاگتے ہوئے نظر آرہے تھے جن میں منتری اور دیگر وی آئی پیز معروف ٹی وی چنلوں کے کیمرہ مینوں کے ساتھ

سیلاب کا مشاہدہ کرر ہے تھے تا کہ شام ٹی وی کی خبروں اور سنسنی خیز پروگراموں کے لئے مواد اکٹھا کرسکیں۔ بیچ بیچ میں برسرِ اقتدار حکمرانوں سے پانی کی بوتلیں یا پھر بسکٹ کے پیکٹ وغیرہ پھنکواتے ہوئے' ویڈیو بھی بنوائے جاتے تھے تا کہ شام' کئی ٹن سامان' سیلاب متاثرین تک پہنچانے کے ثبوت جٹلائے جاسکیں۔

سیلاب زدہ علاقوں میں اکثر لوگ گھروں کی چھتوں پر پھنس گئے تھے کچھ گھروں کو ایسے ہی چھوڑ کر محفوظ مقامات کی طرف عجلت میں اپنی جان بچانے کے لئے نکل پڑے تھے۔

پاس پڑوس کے اضلاع سے سیلاب سے محفوظ' مخیر' ہمدرد اور آسودہ حال لوگ' راشن' پینے کا صاف پانی' ادویات' سبزی' دودھ اور دیگر ضروری سامان لے کر کناروں پر اور کشتیوں میں متحرک تھے اور جگہ جگہ پر امدادی کیمپ لگے ہوئے تھے جہاں پر متاثرین کے لئے دووقت کا کھانا تیار کیا جاتا تھا اور تقسیم کیا جاتا تھا محلہ کمیٹیاں بہت زیادہ سرگرمِ عمل تھیں۔

برسر اقتدار سیاست دانوں سے لوگ خارش زدہ کتوں کی طرح نفرت کرنے لگے تھے اور ان میں بھی اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ لوگوں' خاص طور پر بھیڑ بھاڑ والے عارضی کیمپوں میں جا کر اپنی جان ہلاکت میں ڈال دیں؟۔

اسطرح کی صورتِ حال ہر بھاڑ یا سیلابی ریلے کی اچانک آمد سے پیدا ہوتی ہے۔اس میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ کچھ باتیں ان سے ہٹ کر بھی ہیں۔ جو عام نہیں بلکہ مخصوص و منفرد ہیں۔ یہ سیاست دانوں کی باتیں نہیں ہیں جو اس طرح کی سچویشن کو ہمیشہ اپنے حق میں کرنے اور حزبِ مخالف کو نیچا دکھانے یا پھر ووٹ بینک کی سیاست کے لئے انجام دیتے ہیں۔ بلکہ یہ عام' ہم اور آپ جیسے لوگوں کے ہی' کچھ منفرد اور مخصوص واقعات ہیں۔

سلیم صاحب کا واقعہ ہی لیجئے؟ شہر کے ایک گنجان علاقے میں تیز رفتار بھاڑ کا پانی گھس جانے کے بعد گھر میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے جان بچانے کے لئے قدرے محفوظ علاقے کی طرح بھاگ گئے۔ سیلاب کے پانی میں زرا سا ٹھہراو آجانے کے بعد جب گھر کی طرف رخ کیا تو سارا قیمتی ساماں لٹا ہوا پایا۔ ایسا ان کے کئی پڑوسیوں کے ساتھ بھی ہوا۔ ایک صاحب نے مکان کی سلیب پر سامان رکھا تھا جو وہاں سے غائب ہوا۔ پولیس بچاری بھی کیا کرتی، وہ ایک تو اپنی جان بچانے میں لگی ہوئی تھی دوسرا آنے والی بھاری امداد کی تقسیم کے فکر و غم میں مبتلا دکھ رہی تھی۔ محکمہ مال کے پٹواریوں کی طرح ہی، جو ان سے طلب ہونے والی رپورٹوں کی Wording کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ کیا کیا طور طریقے اختیار کرنے ہیں اور معاملے سے کس طرح نمٹنا ہے۔

سیلابی ریلے سے محفوظ، ایک بستی کے رضا کار، جب متاثرہ لوگوں میں گھر گھر چاول، کپڑے، نقدی اور دیگر ضروری ساز و سامان اور امدادی اشیاء تقسیم کرنے گئے تو کچھ لوگ راستے میں ہی بوریاں لے کر بیٹھے ہوئے تھے۔ جب انہوں نے بات واضح کر دی کہ اپنے اپنے گھروں میں بیٹھئے ہم ایک ایک گھر میں آ کر سامان تقسیم کرینگے تو وہ لوگ لڑائی جھگڑے پر اتر آئے کیونکہ وہ وہاں کے تھے ہی نہیں، صرف مال جمع کرنے آئے تھے۔ جب ایک رضار کار نے ایک عورت کو پانی کی بوتل تھمادی تو وہ اس پر برس پڑی کہ مال خود ہڑپ کیا ہوگا اور صرف پانی کا بوتل مجھے تھمار ہے ہو؟ ہاں یہ بات بھی ہے کہ کچھ پاس پڑوس کے پیشہ ور مانجھی کشتیاں لے کر میدان میں اترے تھے اور ہزاروں کی منہ مانگی رقم، سونے کے زیورات تک، جان بچانے کے عوض وصول کرر ہے تھے۔

ایک جوان دکاندار کی دکان، جب ڈوبنے لگی تو شام ڈھلتے ہی وہ دکان سے قیمتی تھان نکالنے کے لئے گاڑی میں آیا۔ لیکن اتنی ہی دیر میں پانی کی سطح تشویشناک حد تک بڑھنے لگی۔ وہ کچھ دوسرے دوستوں کے ساتھ وہاں سے فوراً نکل آیا۔ اس کا موبائل

دوکان کے باہر گر گیا تھا۔گاڑی رکوا کر موبائل لانے کے لئے جب وہ دکان پر واپس آنے لگا تو سیلابی ریلا اسے بہا کر اپنے ساتھ لے گیا۔ گاڑھی میں بیٹھے باقی لوگ سمجھے شاید کہیں اور نکل گیا ہوگا۔ موبائل رابطہ پہلے ہی کٹ چکا تھا۔ اسلئے صحیح صورت حال کا اندازہ نہ لگ سکا۔ چار روز بعد اس کی لاش، پاس ہی ایک سی آر پی بنگر کے ارد گرد پائی گئی اس کے کپڑے بنگر کے چاروں طرف لگائی گئی کانٹے دار تار میں الجھے ہوئے پائے گئے۔

افواہ بازوں نے بھی خوب اپنے جوہر دکھائے ایک مشہور ڈاکٹر کی پوری فیملی کو بہتے بہتے جواہر نگر سے پاکستان پہنچوا دیا۔ دوسرے مشہور معالج کو گھر میں مروا دیا۔ تین سو مرے ہوئے لوگوں کا پاکستان میں بہہ کر نکل جانے اور پھر وہاں ان کا نمازِ جنازہ پڑھوانے کی افواہ بھی پھیلائی گئی وغیرہ۔

ایک ٹی وی چنل پر رپورٹر، سیلاب متاثرین میں سے ایک شخص سے بات کر رہا تھا اور اس کی ویڈیو ریکارڈنگ ہو رہی تھی۔ جونہی اس نے یہ بات بتانی شروع کر دی کہ کشتی میں سی آر پی رسکیو ٹیم کے آفیسر سے اس نے گڑگڑاتے ہوئے اپنی جان بچوانے کی اپیل کی تو اس نے جواب دیا۔ ''پتھر تو نہیں مارنے ہیں؟'' اور اس کے سامنے سے گذر کر نکل گیا۔ تو رپورٹر نے فوراً بات کاٹتے ہوئے کیمرے کا منہ دوسری جانب پھیر دیا۔

کشمیر آئے ہوئے جتنے ٹورسٹ رسکیو کئے گئے اور ہوائی جہاز سے باہر لئے گئے وہ پرس اور پرنٹ میڈیا پر صرف ایک ہی رٹا رٹایا بیان دے رہے تھے کہ جیسے انہیں سب کچھ لکھ کر دیا گیا تھا کہ اس سے ہٹ کر وہ ایک بات بھی نہیں بول رہے تھے۔ ان سے یہ سب کچھ کہلوایا جا رہا تھا یا ان کے کہے ہوئے کی ایڈیٹنگ ہو رہی تھی؟ کچھ کہا نہیں جا سکتا؟ جبکہ زمینی حقائق اس کے بالکل برعکس تھے اور مکمل طور پر مختلف تھے۔ مقامی اور غیر مقامی لوگ اس بات پر متفق تھے کہ ریاستی حکومت کہیں پر موجود ہی نہ تھی سب لوگ برسرِ اقتدار حاکموں کو جی بھر بھر کے کوس رہے تھے اور گالیاں

دے رہے تھے۔ سیاسی ضرورتوں کے پیشِ نظر ٹی وی چنل والے اس طرح کے ویڈیو کو خوب دکھا رہے تھے۔ جو غیر ریاستی باشندہ مقامی کشمیریوں کی بہادری، بے لوث خدمت، بھر پور تعاون، ھمدرری وامداد کی بات کر رہا تھا وہ فرقہ پرست میڈیا کے برداشت سے باہر تھا اور یہ حقیقت بھی تھی کہ اگر اس خدائی قہر میں کوئی، بلاامتیاز خدمتِ خلق کے حقیقی جذبے سے سرشار و مصروف تھا تو وہ صرف مقامی آبادی ہی تھی۔ باقی جتنے بھی لوگ اپنے منصبی فرائض کی انجام دہی میں لگے ہوئے تھے ان کی اپنی اپنی ترجیحات تھیں۔

ایک نیوز چنل نے اپنے ایک رپورٹر کی شجاعت و بہادری میں وہ ویڈیو اور قصیدے پیش کئے کہ لگ رہا تھا کہ اگر فرقہ پرستی کی سیاست آڈے نہ آئی تو اس سال کا کم از کم ''پدم شری'' کا ایوارڈ یا اعزاز ان کے حق میں کہیں نہیں گیا ہے؟ ثبوت کے طور پر مذکورہ رپورٹر، جان کی بازی لگا کر، جس اکلوتے ویڈیو شارٹ یا فلم میں، جن مستورات کو فلمی انداز میں، مخصوص سیلابی جیکٹ پہن کر، بڑھتے ہوئے سیلابی ریلے میں، کھڑکی سے چھلانگیں لگوا کر، نیچے مخصوص کشتی میں کیچ کر کے داد تحسین حاصل کر رہا تھا وہ دراصل اس رپورٹر کے اپنے فیملی ممبران تھے۔ اس نے اپنے اثر رسوخ سے، کشتی منگوا کر، اپنے گھر کی کھڑکی سے اسے لگوا کر، ایک تیر سے دو نہیں، کئی شکار کر لئے، اپنے افرادِ خانہ کو بچا کر محفوظ مقام تک پہنچا دیا، کم از کم پدم شری کے دعویداروں میں اپنا نام لکھوایا اور کمپنی (ٹی وی چنل) کی مشہوری بھی کروائی۔ اور جو اصل ہیرو ہیں انہیں کوئی کوریج نہیں ملی اسلئے وہ پسِ پردہ چلے گئے اور اب تک گمنام ہیں کہ کوئی ان کا پوچھنے والا تک نہیں؟۔ نہ انہوں نے منصوبہ بند طریقے سے فلم کھنچوا کر یا کیمرہ مین کو اپنے ساتھ لا کر پبلسٹی کے لئے اسطرح کا کام کیا۔

کچھ دن بعد سیلاب کا پانی اترتے ہی ایک علاقے میں تین اجنبی اشخاص، ایک تابوت کو، بغیر کسی چوتھے شخص کے کاندھا دینے والے کے، ایک طرح سے گھسیٹتے گھسیٹتے لے جا رہے تھے۔ مسجد سے نکلنے والے تین نمازیوں کی ان پر نظر

پڑ گئی۔ شام کا وقت تھا۔ انہیں بہت برا محسوس ہوا کہ حالت کہاں تک پہنچ گئی ہے کہ میت کے کفن دفن کے لئے بھی چار آدمی' کاندھا دینے والے میسر نہیں ہو پا رہے ہیں؟ انہوں نے انہیں روکا اور پوچھنے لگے۔ ''بھائی اس میں کیا ہے اور اسے کہاں لے جا رہے ہو؟'' ایک شخص نے فوراً حاضر جوابی سے بات کاٹتے ہوئے مختصر سا جواب دیا۔ ''بھائی صاحب اس میں میت ہے؟

''کس کی میت؟'' دوسرے نمازی نے پوچھا۔

''ڈوب کر مرنے والے ایک لاوارث شخص کی میت؟'' اسے جواب مل گیا۔

ذرا ہم بھی تو دیکھیں کہ کس لاوارث شخص کی میت ہے؟ ہمارے علاقے سے بھی کئی لوگ لاپتہ ہیں۔ کوئی ہمارا جان پہچان والا تو نہیں؟'' نمازی بول اٹھا۔

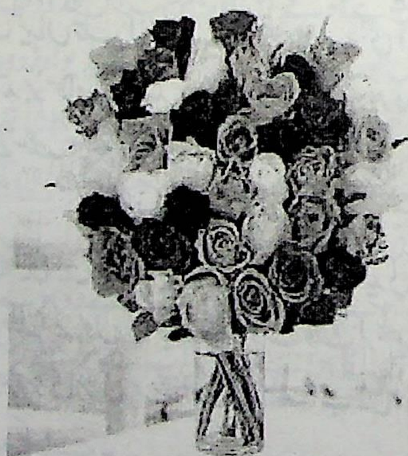
جب یہ صورت حال پیدا ہوگئی تو تینوں اشخاص نے تابوت کاندھوں سے اتار کر نیچے رکھ دیا اور گلی کی طرف سرپٹ بھاگنے لگے۔

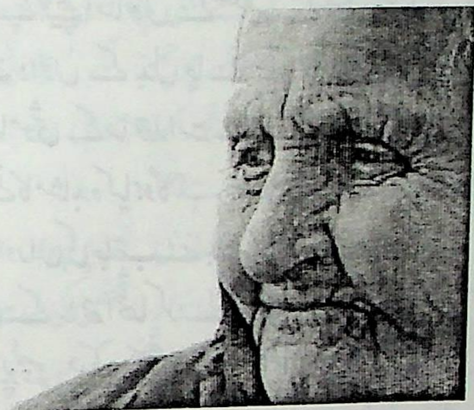
نمازی حیران کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے؟ جب تابوت کا ڈھکن کھول دیا گیا تو تابوت' عام کشمیری گھروں میں کھانا بنانے اور کھانے پینے کے تانبے کے برتنوں سے بھرا پڑا تھا۔ نمازیوں کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ وہ اس گلی کی طرف غور سے تکنے لگے جہاں سے تابوت کو کاندھا دینے والے وہ تین اشخاص بھاگ کھڑے ہوئے تھے اور نظروں سے اوجھل بھی ہو گئے تھے۔

اس بات پر سب لوگ متفق ہیں کہ انہوں نے زندگی میں پہلی بار اسطرح کے شدید سیلابی ریلے کو دیکھا ہے اور اس سے پیدا شدہ اتنی وسیع تر تباہ کاریوں کا بچشمِ خود مشاہدہ کیا ہے۔ انسانوں کی بات تو الگ ہے۔ کسی قدیم مسجد کے صحن سے اٹھائے گئے اس پرانے تابوت نے بھی شاید پہلی بار ہی خود کو' بھاری بھر کم ہونے کے باوجود بھی صرف تین کاندھا دینے والوں کے 'خود کے' گھسیٹنے سے انجر پنجر ڈھیلا

ڈھالا ہوتے ہوئے محسوس کیا ہوگا، کفن میں لپٹی ہوئی انسانی لاشوں کے بجائے، کھانے پینے اور پکانے کے برتنوں کو ڈھونے، اپنے پیچھے انسانوں کے جمغفیر کے بجائے، صرف تین آدمیوں کے، بیچ بیچ میں کندھا دینے والوں کے بدل جانے کے بغیر ہی، اٹھائے جانے، ذکر اللہ کا ورد کرنے کے بجائے خاموشی کے ساتھ راستہ طے کرنے، مزار و مقبرے کے بجائے کسی اجنبی منزل کی طرف جانے کا مشاہدہ کیا ہوگا؟۔

اب اسے تین نمازی اور ان کی جانب سے بلایا گیا چوتھا کاندھا دینے والا بھی مل گیا تھا جو اسے بڑے اطمنان کے ساتھ اٹھا کر لے جا رہے تھے بس ذرا سا کنفیوژن یہ تھا کہ مقبرہ کا گیٹ چھوڑ کر، یہ پولیس چوکی کے گیٹ میں داخل ہو رہے تھے جو اتفاقاً ساتھ ساتھ ہی تھے؟؟۔





آپا

آپا میری بڑی بہن ہے۔ میری اماں جیسی ہی۔ کم سنی میں والدین کے انتقال کے بعد، آپا نے ہی مجھے پالا پوسا، پڑھایا لکھایا ہے۔ گھر محلے اور پاس پڑوس کے لوگ، یہاں تک کہ ان سے عمر میں بڑے بھی آپا کو آپا کہہ کر ہی مخاطب کرتے ہیں۔ ان کا تدبر، سخاوت، ھمدردی اور خلقِ عظیم، دور دور تک مشہور ہے۔ اپنے پرائے چھوٹے بڑے، سب ان کی بہت تعظیم وتکریم کرتے ہیں۔

آپا کی میٹھی میٹھی اور مخلصانہ باتیں سب لوگوں کی ڈھارس بندھاتی ہیں اور حوصلہ دیتی ہیں کہ ناامیدی میں بھی ایک امید کی کرن نظر آتی ہے لیکن کل سے آپا ٹوٹ چکی ہے بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر چکی ہے تو شاید بے جا نہ ہوگا۔ میں نے زندگی بھر بڑی بڑی پریشانیوں اور مصائب میں انہیں اتنا پریشان اور نڈھال ہوتے ہوئے نہیں دیکھا ہے۔

پوری وادی عالم آب ہو چکی ہے۔ سارے شہر کیا، گاؤں گاؤں، قریہ قریہ، قہر انگیز سیلاب کی زد میں ہے اور پانی میں تیر رہا ہے۔ دو دو تین تین

منزل تک مکانوں میں پانی بھر چکا ہے اور سطحِ آب آج بھی اوپر آ رہی ہے۔ رات دن لوگوں کی آہ و پکار، اور رونے سسکنے کے سوا کچھ بھی نہیں سنائی دیتا۔ حکومت اور رسکیو ٹیمیں مدد کریں تو کس کس کی کریں؟ لاتعداد لوگ، اونچی اونچی عمارتوں کی چھتوں پر روتے اور بلکتے ہوئے مدد کی پکار کرتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔ کوئی پرسانِ حال نہیں ہے، ہر طرف تباہی اور بربادی کے مناظر، درسِ عبرت دے رہے ہیں۔

اگر یہ دلدوز اور ناقابلِ برداشت حادثہ نہ ہوا ہوتا تو شاید ہم بھی کسی مکان کی چھت پر اب تک بھوکے پیاسے پڑے ہوتے اور کسی معجزے کے انتظار میں ہوتے یا پھر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟

یونیورسٹی کا یہ وسیع و عریض میدان ابھی تک سیلاب کے پانی سے محفوظ ہے اور ہم کو بھی ایک ہال میں پاس پڑوس کے اور بہت سے سیلاب زدگان کے ساتھ ٹھہرایا گیا ہے اور یونیورسٹی کے میس سے دال چاول کا بندوبست بھی محدود پیمانے پر ہو رہا ہے۔ آنے جانے کے تمام راستے بند پڑے ہوئے ہیں اور ہم سب اس محدود جگہ پر محصور ہو کر رہ گئے ہیں۔ موبائل نٹ ورک مکمل طور پر بیٹھا ہوا ہے اور مقامی ریڈیو اور دوردرشن اسٹیشنوں میں ایک ایک منزل تک پانی بھر جانے کی وجہ سے نشریات رکی ہوئی ہیں۔ ایک دوسرے کا کوئی اتہ پتہ نہیں ہے اور نہ کوئی رابطہ ہو پا رہا ہے۔ سب لوگ اس تذبذب میں ہیں کہ عمر بھر کی محنت و مشقت اور عرق ریزی سے کمایا ہوا گھر اور مال و اسباب داؤ پر لگا ہوا ہے اور جان کے لالے بھی پڑے ہوئے ہیں۔ ہر کوئی ملنے والے دوسرے شخص سے سیلاب کی صورتِ حال معلوم کرنے میں لگا ہوا ہے اور سطحِ آب کے بڑھنے یا گھٹنے کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔

یونیورسٹی کے شمال کی طرف ایک چھوٹا سا گیٹ کھلا ہوا ہے اور وہاں ایک رہائشی کالونی ہے اور چند چھوٹی سی دکانیں بھی۔ میں وہاں ضرورت کی چند دوائیاں

لانے کے لئے جارہا تھا۔ جاتے جاتے میں نے آپا سے بس اتنا پوچھا؟ ''آپا' کوئی چیز لانی ہوتو بتادو؟ ممکن ہے وہاں کچھ ملتا ہو؟''

آج زندگی میں پہلی بار آپا کے جواب نے میرے دل پر جیسے آرا سا چلا دیا؟ روہانسی آواز میں کہنے لگی ''دانش میاں' تابوت لاسکتے ہوتو لانا؟ بہت جی کر دیکھ لیا' بس اب زندہ رہنا نہیں چاہتی ہوں ــــــــــــ؟''

آپا کا یہ غیر متوقع جواب سن کر میں بھی جیسے سکتے میں آ گیا اور خاموش رہا جیسے میری زبان گنگ ہوگئی ہو اور حلق میں الفاظ جیسے اٹک رہے ہوں۔ آپا بھی میرے پورے شریر کو جھنجھوڑ کر خاموش ہوگئی۔ کوئی دوسرا ہوتا تو شاید کچھ کہہ بھی دیتا۔ آپا کو تسلی و تشفی دے دیتا' ہمت وحوصلہ بڑھاتا' قرآنِ کریم کی کوئی آیتِ مبارکہ یا کوئی حدیثِ شریف سنا کر اس کی ڈھارس بندھا دیتا کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی آزمائش ہے اس پر صبر وشکر کی تلقین کی گئی ہے۔ لیکن آپا کے منہ کی باتیں' آپا کے منہ میں ڈالنے کی' مجھ میں ہمت تھی نہ حوصلہ' مجھ سے کوئی جواب ہی نہ بن پڑا اور نہ کوئی لفظ ہی میرے منہ سے نکلا' نکلتا بھی کیسے ؟ آپا کی پوری زندگی ایک فلم کی طرح' میری آنکھوں کے سامنے گشت کرنے لگی۔

عین عالمِ شباب میں والدین کا انتقال ہوا تھا۔ آپا کا نکاح' پھوپھازاد بہن نے کرایا تھا۔ گھر گرہستی کی پریشانیوں کے ساتھ عمر بھر جوجھتی رہی۔ جوانی میں ہی شوہر کا انتقال ہوگیا۔ پشمینہ کات کات کر بچوں کی پرورش کی' بیٹی کی شادی کی تیاریاں چل رہی تھیں کہ وہ اچانک ایک حادثے کی شکار ہوکر داغِ مفارقت دے گئی اور اب اکلوتا بیٹا کل سیلاب کے پانی میں ناف تک ڈوبا ہوا' گھر کا سامان اٹھاتے اٹھاتے' بجلی کے تار کو چھو کر' لقمہ اجل بن گیا ایک آدھ ہفتہ بعد ہی اس کا نکاح ہونے والا تھا۔ شہنواز' آپا کا بہت لاڈلا اور فرمانبردار بیٹا تھا اس کی جدائی نے آپا کی کمر ہی توڑ کر رکھ دی اور اس کا حوصلہ ہی جواب دینے لگا۔ جسے اس عمر میں بحال کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھا۔

میں چپ چاپ اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ وہاں سے اٹھنے کی ہمت ہی نہیں ہو پا رہی تھی۔ پاس ہی بیٹھی ہوئی خطیجہ چاچی نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اس آپا کی ڈھارس بندھانی شروع کر دی جو آپا دنیا بھر کے لوگوں کی ڈھارس بندھاتی تھی۔

کچھ وقفے کے بعد، پاس والی مسجد سے عصر کی اذان ہونے لگی۔ میں نے آپا کی طرف دیکھا جو پیچھے کی دیوار سے ٹیک لگائے ہوئے، آنکھیں بند کئے ہوئے تھیں۔ میں نے اس کے اوپر کمبل ڈالتے ہوئے، خطیجہ چاچی سے اس کا خیال رکھنے کے لئے کہا اور خود مسجد کی طرف چل نکلا۔

نماز پڑھ کر جب میں مسجد سے نکلنے لگا تو میرا ایک پڑوسی الطاف گھبراہٹ کے عالم میں میری طرف لپک رہا تھا۔ الطاف آپا کی بگڑتی ہوئی حالت کے بارے میں بتا رہا تھا کہ ہم دونوں تیز تیز قدموں کے ساتھ واپس اس ہال کی طرف لوٹ رہے تھے جہاں ہمیں ٹھہرایا گیا تھا۔

گبھراہٹ کے عالم میں آپا کی نبض ٹٹولنے سے پتہ چلا کہ آپا ملکِ عدم کی طرف نکل پڑی ہے اور اب ہم میں نہیں ہیں۔

پاس پڑوس کے لوگ جمع ہو کر کفن دفن کا بندوبست کرنے لگے ابھی ایک آدھ گھنٹہ قبل، جس تابوت کی خواہش آپا نے ظاہر کی تھی وہ لایا گیا اور متصل ہی ایک ٹیلے پر بنے آبائی قبرستان میں آپا کو ان کے میاں، بیٹی، اور بیٹے کی قطار میں دفنا دیا گیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

سیلاب کے سمندر کا یہ ریلا کچھ دن بعد گزر جائے گا اور شہروں، قصبوں، بستیوں، کھیتوں یہاں تک کہ غیر آباد زمینوں تک کا، بھاڑ کا پانی بھی اتر جائے گا یا خشک ہو جائے گا لیکن ۔۔۔۔ میری ۔۔۔۔ آنکھوں ۔۔۔۔ کے سیلاب کا یہ ریلا ۔۔۔۔ کب گذر جائے گا؟ کب تھم جائے گا؟ ۔ جسے میں اپنی پوری قوت، طاقت اور اپنی مضبوط پکڑ سے

پلکوں کے باندھ اوپر کر کے، روکنے کی ناکام کوشش کرتا رہتا ہوں لیکن یہ ریلا پھر بھی ان باندھوں کو توڑ کر بہہ نکلتا ہے اور مسلسل بہتا ہی جاتا ہے اور میرے قلب و روح کی گہرائیوں میں بڑے بڑے شگاف بھی ڈالتا ہے۔ جنہیں پاٹنا اب، میرے بس کی بات نہیں ہے؟ کہ اب۔۔۔میں اکیلا۔۔۔ہو گیا ہوں؟۔ اور میرے پاس۔۔۔۔۔۔تسلی اور تشفی دینے والی۔۔۔۔۔میری اماں جیسی ہی، ۔۔۔۔۔میری بڑی بہن، ۔۔۔۔۔۔میری آپا بھی۔۔۔۔۔۔نہیں ہے؟؟۔





سالہ جنت میں مر گیا۔۔۔۔؟!!

گھوش بابو میرے دیرینہ دوست تھے۔ادھیڑ عمر کے،لیکن بڑے چاک و چوبند اور مستعد و فعال ۔ چال ڈھال بھی بہت اچھی تھی ۔ کولکتہ میں بزنس کرتے تھے۔کھاتے پیتے اور شریف گھرانے سے ان کا تعلق تھا۔بیوی فرمانبردار اور خوبصورت تھی ۔عمر میں گھوش بابو سے یہیں کوئی آٹھ دس سال چھوٹی تھی۔ ان کی تین بچیاں تھیں۔ بڑی والی نے انجینئرنگ اسی سال مکمل کی تھی اور قابلیت اور ذہانت کی وجہ سے اس کی نوکری بھی لگ گئی تھی اور نوکری لگتے ہی ایک اچھے گھرانے میں رشتہ بھی طے ہو گیا تھا اور اسی سال دسمبر میں شادی کے بندھن میں بھی بندھنے والی تھی۔

ایک عرصہ سے میں گھوش بابو کو جانتا ہوں اس کے تقریباً پورے خاندان

کے ساتھ متعارف بھی ہوں اور اس کے سسرال والوں سے بھی تعلقات ہیں جو سب اچھے اور پڑھے لکھے لوگ ہیں۔

گھوش بابو کے اکلوتے بڑے بھائی پیشے سے وکیل ہیں۔ بڑے خشک قسم کے آدمی ہیں ہر بات پر جرح کرنا جیسے ان کی فطرتِ ثانیہ ہے کہ بات چھڑی بھی نہیں اور تفتیش شروع ہوگئی۔ اس وجہ سے اکثر، اپنے پرائے ان سے کھچے کھچے سے رہتے ہیں اور اکثر ان سے، بات کرنے سے کتراتے رہتے ہیں اور اگر بات کریں بھی تو بہت احتیاط برتتے ہیں کہ کہیں وکیل بابو کی تفتیش میں الجھ نہ جائیں۔

انہیں ویسے بھی یہ عادت کچھ زیادہ ہی ہے کہ بات بات پر سالا۔۔۔سالا موقعہ بے موقعہ کہتے ہی رہتے ہیں۔ میں بھی اس ڈر سے ان کے ساتھ بہت کم ملتا جلتا ہوں۔ ہماری ملاقات بس علیک سلیک تک ہی محدود رہتی ہے ویسے بھی ان کے قریبی جان پہچان والے بھی ان سے الجھنا ہر گز پسند نہیں کرتے اور ان سے ایک فاصلہ بنائے رکھتے ہیں۔ میں نے اتنے برسوں میں ان کے ساتھ کسی فردِ بشر کو گھلتے ملتے نہیں دیکھا ہے اور نہ ہی ان کے ساتھ اپنائیت اور کھلے دل وذہن سے، بلا جھجک بات کرتے ہوئے دیکھا ہے، یہاں تک اس کے اہلِ خانہ کو بھی۔ گھوش بابو کی دلی تمنا تھی کہ وہ زندگی میں ایکبار ضرور کشمیر آئیں، مجھ سے ہزار بار کشمیر جنت بے نظیر کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی حسرت کا اظہار کر چکے تھے اور میں نے بھی لاتعداد بار انہیں کشمیر آنے کی دعوت دی تھی لیکن ہر بار ان کی کاروباری یا پھر اور کوئی مصروفیت آڑے آجاتی تھی۔

اس سال دسمبر میں ان کی بڑی بیٹی کی شادی طے تھی اسلئے چند دن قبل مجھے کولکتہ سے ان کا فون آیا کہ وہ اپنے دو قریبی دوستوں کے ساتھ، اسی ماہ کی ۱۷ رتاریخ کو سری نگر ایک ہفتے کی سیر وتفریح کے لئے پہنچنے والے ہیں۔

ہمارے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور میں اسے رسیو کرنے کے لئے

سرینگر کے آئر پورٹ پر پہنچا۔

آنجہانی گھوش بابو کو یہاں پہنچنے ہوئے چھ دن ہو گئے تھے اور گلمرگ، پہلگام، سونہ مرگ، نشاط وشالیمار باغ، چشمہ شاہی۔ ان سب سیاحتی جگہوں کو وہ دیکھ بھی چکے تھے کہ پرسوں شام کو ان کی طبیعت اچانک بہت خراب ہوگئی کہ انہیں میڈیکل انسٹچوٹ میں داخل کروانا پڑا۔ ان کی نازک حالت دیکھ کر ان کے گھر والوں کو فوراً ہی فون پر آگاہ کر دیا گیا۔ معاملے کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے، کل صبح ہی وکیل بابو چار بجے دن کی فلائیٹ سے سری نگر پہنچنے والے تھے کہ صبح نو بجکر چالیس منٹ پر گھوش بابو نے میڈیکل انسٹچوٹ کے ICU میں اپنے پران تیاگ دئے۔

ہم سب کو اچانک اس صدمے سے انتہائی دکھ ہوا اور اس سانحے نے ہمیں نڈھال کر دیا۔ سب لوگوں کو میری طرح ہی یہ پریشانی سب سے زیادہ کھائے جا رہی تھی کہ چار بجے سری نگر پہنچنے والے وکیل بابو کو کیا جواب دیں؟ جن کے سامنے کسی کی کچھ نہیں چلتی!۔

گھر کے بڑے ہال میں آنجہانی گھوش بابو کی میت رکھی ہوئی تھی ان کے ساتھ آئے ہوئے ان کے دوست اور میں انتہائی سوگوار، میت کے قریب ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ دو بجے کے قریب، گھر سے گاڑی وکیل بابو کو آئر پورٹ سے لانے کے لئے روانہ ہوگئی تھی راستے میں ہمارے بڑے بیٹے نے جوان سے قدرے نامانوس ہی تھے ان کے کان میں گھوش بابو کے دیہانت کی خبر پہنچائی تھی۔

ہم سب ہال کے ایک کونے میں، کسی انجانے خوف سے دبک سے گئے تھے۔ کہ وکیل بابو ہال میں داخل ہو گئے۔ ہال میں سکوت سا چھایا ہوا تھا اور ہم سب کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے اور، وکیل بابو۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟ خاموشی سے ہال میں داخل ہو کر سیدھے اپنے چھوٹے بھائی کی میت کے سرہانے انتہائی غمزدہ موڈ میں

کے ساتھ متعارف بھی ہوں اور اس کے سسرال والوں سے بھی تعلقات ہیں جو سب اچھے اور پڑھے لکھے لوگ ہیں۔

گھوش بابو کے اکلوتے بڑے بھائی پیشے سے وکیل ہیں۔ بڑے خشک قسم کے آدمی ہیں ہر بات پر جرح کرنا جیسے ان کی فطرتِ ثانیہ ہے کہ بات چھڑی بھی نہیں اور تفتیش شروع ہوگئی۔ اس وجہ سے اکثر، اپنے پرائے ان سے کھچے کھچے سے رہتے ہیں اور اکثر ان سے، بات کرنے سے کتراتے رہتے ہیں اور اگر بات کریں بھی تو بہت احتیاط برتتے ہیں کہ کہیں وکیل بابو کی تفتیش میں الجھ نہ جائیں۔

انہیں ویسے بھی یہ عادت کچھ زیادہ ہی ہے کہ بات بات پر سالا۔۔۔ سالا موقعہ بے موقعہ کہتے ہی رہتے ہیں۔ میں بھی اس ڈر سے ان کے ساتھ بہت کم ملتا جلتا ہوں۔ ہماری ملاقات بس علیک سلیک تک ہی محدود رہتی ہے ویسے بھی ان کے قریبی جان پہچان والے بھی ان سے الجھنا ہرگز پسند نہیں کرتے اور ان سے ایک فاصلہ بنائے رکھتے ہیں۔ میں نے اتنے برسوں میں ان کے ساتھ کسی فردِ بشر کو گھلتے ملتے نہیں دیکھا ہے اور نہ ہی ان کے ساتھ اپنائیت اور کھلے دل و ذہن سے، بلا جھجک بات کرتے ہوئے دیکھا ہے، یہاں تک اس کے اہلِ خانہ کو بھی۔ گھوش بابو کی دلی تمنا تھی کہ وہ زندگی میں ایکبار ضرور کشمیر آئیں، مجھ سے ہزار بار کشمیر جنت بے نظیر کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی حسرت کا اظہار کر چکے تھے اور میں نے بھی لاتعداد بار انہیں کشمیر آنے کی دعوت دی تھی لیکن ہر بار ان کی کاروباری یا پھر اور کوئی مصروفیت آڑے آجاتی تھی۔

اس سال دسمبر میں ان کی بڑی بیٹی کی شادی طے تھی اسلئے چند دن قبل مجھے کولکتہ سے ان کا فون آیا کہ وہ اپنے دو قریبی دوستوں کے ساتھ، اسی ماہ کی ۱۷ تاریخ کو سری نگر ایک ہفتے کی سیر و تفریح کے لئے پہنچنے والے ہیں۔

ہمارے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور میں اسے رسیو کرنے کے لئے

سرینگر کے آئر پورٹ پر پہنچا۔

آنجہانی گھوش بابو کو یہاں پہنچنے ہوئے چھ دن ہو گئے تھے اور گلمرگ، پہلگام، سونہ مرگ، نشاط و شالیمار باغ، چشمہ شاہی۔ ان سب سیاحتی جگہوں کو وہ دیکھ بھی چکے تھے کہ پرسوں شام کو ان کی طبیعت اچانک بہت خراب ہوگئی کہ انہیں میڈیکل انسٹچوٹ میں داخل کروانا پڑا۔ ان کی نازک حالت دیکھ کر ان کے گھر والوں کو فوراً ہی فون پر آگاہ کر دیا گیا۔ معاملے کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے، کل صبح ہی وکیل بابو چار بجے دن کی فلائٹ سے سری نگر پہنچنے والے تھے کہ صبح نو بجکر چالیس منٹ پر گھوش بابو نے میڈیکل انسٹچوٹ کے ICU میں اپنے پران تیاگ دئے۔

ہم سب کو اچانک اس صدمے سے انتہائی دکھ ہوا اور اس سانحے نے ہمیں نڈھال کر دیا۔ سب لوگوں کو میری طرح ہی یہ پریشانی سب سے زیادہ کھائے جا رہی تھی کہ چار بجے سری نگر پہنچنے والے وکیل بابو کو کیا جواب دیں؟ جن کے سامنے کسی کی کچھ نہیں چلتی!۔

گھر کے بڑے ہال میں آنجہانی گھوش بابو کی میت رکھی ہوئی تھی ان کے ساتھ آئے ہوئے ان کے دوست اور میں انتہائی سوگوار، میت کے قریب ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ دو بجے کے قریب، گھر سے گاڑی وکیل بابو کو آئر پورٹ سے لانے کے لئے روانہ ہوگئی تھی راستے میں ہمارے بڑے بیٹے نے جوان سے قدرے نامانوس ہی تھے ان کے کان میں گھوش بابو کے دیہانت کی خبر پہنچائی تھی۔

ہم سب ہال کے ایک کونے میں، کسی انجانے خوف سے دبک سے گئے تھے۔ کہ وکیل بابو ہال میں داخل ہو گئے۔ ہال میں سکوت سا چھایا ہوا تھا اور ہم سب کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے اور، وکیل بابو۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟ خاموشی سے ہال میں داخل ہو کر سیدھے اپنے چھوٹے بھائی کی میت کے سرہانے انتہائی غمزدہ موڈ میں

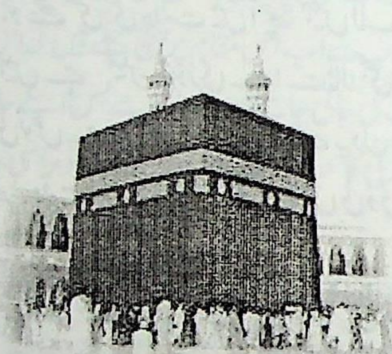
بیٹھ گئے اور بیٹھتے ہی ان کے سر کے اوپر، رکھی ہوئی چادر کھسکانے لگے۔

ہال میں موت کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ سب لوگ نہ جانے کن کن وسوسوں اور اندیشوں میں مستغرق تھے کہ کس کس سے کیا کیا پوچھا جائے گا او۔ کیا کیا جرح کی جائے گی یا قبول کروایا جائے گا؟ آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کے چہروں پر مردنی سی چھائی ہوئی تھی ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ گھڑی کی سوئیاں رک گئی ہیں اور وقت اپنی رفتار بھول گیا ہے!۔

اسی اثنا میں وکیل بابو کا یہ جملہ جیسے آسمان پر چمکنے والی زور دار بجلی کی طرح کوندا" ۔۔۔۔سالہ جنت میں مر گیا!؟"

وکیل بابو کی زبان سے صرف یہ ایک ہی جملہ برآمد ہوتے ہی دوبار خاموشی چھا گئی اور سب لوگ انتہائی متحیر نظروں سے ایک دوسرے کو یوں تکنے لگے جیسے ایک بہت بڑی سونامی کا خطرہ اچانک ٹل گیا ہو اور سمندر کنارے بسنے والے مچھیروں کی بستی میں اچانک خوشی کا بگل بج گیا ہو۔





سونہ بھٹ کا حج قبول ہو گیا!!؟۔

مجھ سے ایک پل بھی بے کار بیٹھا نہیں جاتا۔ شاید یہ عادت ہماری سرشت میں ہی ہے۔ تایا مرحوم کی عمر لگ بھگ سو سال تھی اور وہ اس عمر میں بھی سوئی میں دھاگا ڈال کر رفوگری کے کام میں مشغول ومنہمک رہا کرتے تھے اس بات کے باوجود بھی کہ ان کی کمائی پر، ان کا اور ایک بھتیجا، اپنا حق جتاتا تھا اور اسے اس طرح ہڑپ کرتا تھا کہ تایا بھی کچھ نہیں کہہ سکتے تھے اور ان کی ذاتی کمائی میں بھی ان کے ہاتھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔

کئی بار میں نے انہیں یہ کہتے ہوئے بہت سمجھایا بجھایا بھی کہ ہماری موجودگی میں، اسقدر پیرانہ سالی میں، انہیں عرق ریزی اور اسقدر سخت محنت ومشقت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ جبکہ ہم ان جیسے دس اشخاص کو کھلا پلا سکتے ہیں۔ لیکن ان کا یہ جواب مجھے ہمیشہ لاجواب کر دیتا تھا کہ ’بے کار شخص پر لعنت برستی رہتی ہے‘

کئی دنوں سے میرے پیر میں موچ آجانے کی وجہ سے، پیر بری طرح سے سوجھ جانے کی بدولت واش روم تک جانا بھی میرے لئے بہت مشکل ہو رہا تھا اور مجھے مجبوراً بستر پر لیٹنا پڑ رہا تھا جو مجھے کسی بھی حالت میں اچھا نہیں لگ رہا تھا ایک ہی جگہ پر ٹکے رہنے کی عادت مجھے نہیں ہے لیکن مجبوری ہے اسے ٹالا بھی تو نہیں جا سکتا ہے کئی دنوں سے حالت بس جوں کی توں ہے اور میرے حساب سے یہ دن بالکل بے کار گذر رہے ہیں کبھی کبھی ٹی وی دیکھ کر وقت گذار رہا ہوں۔ کمرے میں ٹی وی بھی لگا ہوا نہ ہوتا تو میرے لئے اسطرح بے کار بیٹھنا وبالِ جان بن گیا ہوتا۔

صبح سویرے اٹھ کر نمازِ فجر سے فارغ ہو کر چائے ناشتے کا انتظام ہو گیا اور اب ہم دونوں میاں بیوی چائے پی رہے ہیں اور ٹی وی پر مسجدِ حرام میں نمازِ فجر کو پڑھاتے ہوئے Live دیکھ رہے ہیں۔

چند سال قبل کی فریضہ حج کی ادائیگی کی سب یادیں ایسے یاد آنے لگیں جیسے کل ہی کی بات ہو۔

نمازِ تہجد سے قبل کیسے طواف کرتے تھے؟ پھر طواف کی تکمیل کے بعد کہاں زم زم کے گلاس بھر بھر کر نوش کئے جاتے تھے؟ پھر نمازِ تہجد کہاں ادا ہوتی تھی اور پھر مطاف میں، نمازِ فجر کی ادائیگی کیسے ہوتی تھی؟ وغیرہ۔

مرحوم ثنا اللہ بھٹ کو سونہ بھٹ کے نام سے جانا جاتا تھا ویسے بھی خدمتگاروں اور نوکروں کو کون القاب و آداب سے پکارتا ہے۔ عمر اسی سال سے اوپر ہی ہوگی۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ کس گاؤں سے ان کا تعلق تھا اور وہاں ان کے کون کون قریبی رشتہ دار موجود ہیں یا کوئی ہے بھی یا نہیں؟ شاید وہ لوگ جانتے ہونگے جن کے ہاں سونہ بھٹ ایک لمبے عرصہ تک گھریلو خادم کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔

یہ درگاہ شریف کے متولی تھے ان کے ہاں سونہ بھٹ دن رات خدمتگار کی

حیثیت سے مستعد ومتحرک رہا کرتے تھے ایک چاک وچوبند خادم کی طرح ہی، کہ آج اس گھر کے جو اشخاص بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں سونہ بھٹ کی ہی خدمت و پرورش کے مرہونِ منت رہ کر یہاں تک پہنچ چکے ہیں۔ لیکن ان میں ایک کو بھی اس کا احساس نہیں ہے کہ سونہ بھٹ کبرسنی کی وجہ سے اب اس مقام پر پہنچ چکے ہیں کہ اس سے خدمت نہیں لی جاسکتی ہے۔ اس کی خدمت کی جانی چاہئے تو درکنارا سے بس اپنے حال پر چھوڑا جائے اور اس کی محدود ضروریات زندگی کا خیال رکھا جائے نہ کہ ذرا ذرا سی بات پر اس کو ڈانٹ ڈپٹ پلائی جائے۔

سونہ بھٹ اس دوران کئی بار مختلف حوادث کا بھی شکار ہوا تھا کبھی اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی تو کبھی اس کی کمر شدتِ درد سے جھکتی ہوئی محسوس ہونے لگی لنگڑا لنگڑا کر چلنا اور اپنا رزق حلال کرنا اس کی ضرورت بھی تھی اور اس کی مجبوری بھی اور حج بیت اللہ کا فریضہ پورا کرنا اس کی زندگی کا ایک دیرینہ خواب تھا خواب بھی ایک ایسا کہ جسے وہ کسی بھی صورت میں پورا کرنے کا قصد کر چکا تھا اس خواب کی تکمیل کا اشتیاق وجذبہ نہ جانے اسے کب سے تھا کچھ کہنا مشکل ہے۔

درگاہ شریف میں بہت مخیر لوگ اسے نذر ونیاز دیتے تھے جسے وہ حجِ بیت اللہ کا فریضہ ادا کرنے کے لئے جمع کر رہا تھا اور مہینے میں ایک دو بار وہ متصل اپنے جان پہچان والے گھروں میں جا کر، پانی کی بوتل، شیرینی اور چند سوکھی اور خشک کھجوریں لے کر بھی لنگڑا لنگڑا کر جاتے تھے تا کہ ان لوگوں سے سو پچاس روپئے وصول کر سکیں اور اپنے دیرینہ خواب کی تکمیل جلد از جلد کر سکیں۔

مسجدِ حرام سے نمازِ فجر ابھی ادا ہی ہو رہی تھی اور ہم اسے Live دیکھ رہے تھے کہ فریدہ کو اچانک سونہ بھٹ کی یاد آ گئی جسے اب آٹھ دس سال انتقال کئے ہوئے ہو گئے ہونگے۔ حج بیت اللہ کا فریضہ ادا کر کے ایک ڈیڑھ سال بعد ہی انتقال کر گئے تھے۔

کئی دنوں سے میرے پیر میں موچ آجانے کی وجہ سے، پیر بری طرح سے سوجھ جانے کی بدولت واش روم تک جانا بھی میرے لئے بہت مشکل ہورہا تھا اور مجھے مجبوراً بستر پر لیٹنا پڑ رہا تھا جو مجھے کسی بھی حالت میں اچھا نہیں لگ رہا تھا ایک ہی جگہ پر ٹکے رہنے کی عادت مجھے نہیں ہے لیکن مجبوری ہے اسے ٹالا بھی تو نہیں جاسکتا ہے کئی دنوں سے حالت بس جوں کی توں ہے اور میرے حساب سے یہ دن بالکل بے کار گذر رہے ہیں کبھی کبھی ٹی وی دیکھ کر وقت گذار رہا ہوں۔ کمرے میں ٹی وی بھی لگا ہوا نہ ہوتا تو میرے لئے اسطرح بے کار بیٹھنا وبالِ جان بن گیا ہوتا۔

صبح سویرے اٹھ کر نمازِ فجر سے فارغ ہو کر چائے ناشتے کا انتظام ہو گیا اور اب ہم دونوں میاں بیوی چائے پی رہے ہیں اور ٹی وی پر مسجدِ حرام میں نمازِ فجر کو پڑھاتے ہوئے Live دیکھ رہے ہیں۔

چند سال قبل کی فریضۂ حج کی ادائیگی کی سب یادیں ایسے یاد آنے لگیں جیسے کل ہی کی بات ہو۔

نمازِ تہجد سے قبل کیسے طواف کرتے تھے؟ پھر طواف کی تکمیل کے بعد کہاں زم زم کے گلاس بھر بھر کر نوش کئے جاتے تھے؟ پھر نمازِ تہجد کہاں ادا ہوتی تھی اور پھر مطاف میں، نمازِ فجر کی ادائیگی کیسے ہوتی تھی؟ وغیرہ۔

مرحوم ثنا اللہ بھٹ کو سونہ بھٹ کے نام سے جانا جاتا تھا ویسے بھی خدمتگاروں اور نوکروں کو کون القاب وآداب سے پکارتا ہے۔ عمر اسی سال سے اوپر ہی ہوگی۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ کس گاؤں سے ان کا تعلق تھا اور وہاں ان کے کون کون قریبی رشتہ دار موجود ہیں یا کوئی ہے بھی یا نہیں؟ شاید وہ لوگ جانتے ہونگے جن کے ہاں سونہ بھٹ ایک لمبے عرصہ تک گھریلو خادم کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔

یہ درگاہ شریف کے متولی تھے ان کے ہاں سونہ بھٹ دن رات خدمتگار کی

حیثیت سے مستعد و متحرک رہا کرتے تھے ایک چاک وچوبند خادم کی طرح ہی، کہ آج اس گھر کے جو اشخاص بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں سونہ بھٹ کی ہی خدمت و پرورش کے مرہونِ منت رہ کر یہاں تک پہنچ چکے ہیں۔ لیکن ان میں ایک کو بھی اس کا احساس نہیں ہے کہ سونہ بھٹ کبرسنی کی وجہ سے اب اس مقام پر پہنچ چکے ہیں کہ اس سے خدمت نہیں لی جا سکتی ہے۔ اس کی خدمت کی جانی چاہئے تو درکنار اسے بس اپنے حال پر چھوڑا جائے اور اس کی محدود ضروریات زندگی کا خیال رکھا جائے نہ کہ ذرا ذرا سی بات پر اس کو ڈانٹ ڈپٹ پلائی جائے۔

سونہ بھٹ اس دوران کئی بار مختلف حوادث کا بھی شکار ہوا تھا کبھی اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی تو کبھی اس کی کمر شدتِ درد سے جھکتی ہوئی محسوس ہونے لگی لنگڑا لنگڑا کر چلنا اور اپنا رزق حلال کرنا اس کی ضرورت بھی تھی اور اس کی مجبوری بھی اور حج بیت اللہ کا فریضہ پورا کرنا اس کی زندگی کا ایک دیرینہ خواب تھا خواب بھی ایک ایسا کہ جسے وہ کسی بھی صورت میں پورا کرنے کا قصد کر چکا تھا اس خواب کی تکمیل کا اشتیاق وجذبہ نہ جانے اسے کب سے تھا کچھ کہنا مشکل ہے۔

درگاہ شریف میں بہت مخیر لوگ اسے نذر و نیاز دیتے تھے جسے وہ حجِ بیت اللہ کا فریضہ ادا کرنے کے لئے جمع کر رہا تھا اور مہینے میں ایک دو بار وہ متصل اپنے جان پہچان والے گھروں میں جا کر، پانی کی بوتل، شیرینی اور چند سوکھی اور خشک کھجوریں لے کر بھی لنگڑا لنگڑا کر جاتے تھے تا کہ ان لوگوں سے سو پچاس روپئے وصول کر سکیں اور اپنے دیرینہ خواب کی تکمیل جلد از جلد کر سکیں۔

مسجدِ حرام سے نمازِ فجر ابھی ادا ہی ہو رہی تھی اور ہم اسے Live دیکھ رہے تھے کہ فریدہ کو اچانک سونہ بھٹ کی یاد آ گئی جسے اب آٹھ دس سال انتقال کئے ہوئے ہو گئے ہونگے۔ حج بیت اللہ کا فریضہ ادا کر کے ایک ڈیڑھ سال بعد ہی انتقال کر گئے تھے۔

فریدہ نے جونہی سونہ بھٹ کا نام زبان پر لایا تو نظر کے سامنے ایک اسی سال کا معمر، سفید داڑھی والا نحیف وکمزور، دبلا پتلا کمر جھکا کر۔لنگڑا لنگڑا کر چلنے والا شخص آ گیا، جس کا زرد چہرہ اس کے جسم میں خون کی کمی کی چغلی کھا رہا تھا جس سے چلتے وقت اس کا سانس بھی پھول جاتا تھا۔ایک لمبے عرصہ تک شہر میں رہ کر بھی جس کے زبان و بیان، لب و لہجے اور رہن سہن پر دیہاتی اثر بھی نمایاں اور واضح تھا۔

اکثر چھٹی کے دن صبح صبح ہمارے گھر آیا کرتا تھا اور آواز دے کر سیدھے کچن میں گھس جاتا تھا۔ بچے اس وقت اکثر سو رہے ہوتے تھے۔ پانی سے بھری پلاسٹک کی بوتل فریدہ کی طرف بڑھا کر اپنے مخصوص لہجے میں کہتے تھے کہ یہ ''کیمیا'' کسی صاف و پاک برتن میں ڈال کر بوتل خالی کر کے مجھے لوٹا دو اور پھر جیب سے شیرینی اور چند سوکھی ہوئی خشک کھجوریں بھی دیا کرتے تھے کہ یہ درگاہ شریف کے اندر سے 'تبرک' لایا ہوں خاص طور پر آپ لوگوں کے لئے۔

کبھی فریدہ کے زبردست اصرار پر چائے پی لیتے تھے اکثر نہیں پیتے تھے۔اور پھر فوراً فریدہ سو پچاس کا نوٹ سونہ بھٹ کو ہدیہ کے طور پر تھما دیتی تھی اور سونہ بھٹ فوراً ہی دعا کرتے کرتے ہمارے صحن سے متصل ہمارے قریبی پڑوسی ثناءاللہ کے گیٹ کی طرف یہی عمل دہرانے کے لئے چلے جاتے اور کسی کے ہاں نہیں جاتے تھے۔

فریدہ نے انہی دنوں یہ بھی بتایا تھا کہ کبھی دوسری بوتل سونہ بھٹ کے بیگ میں نہیں ہوا کرتی تھی اور وہ خالی کرائی گئی بوتل میں ہمارے کچن میں لگے ہوئے نل سے ہی پانی بھر کر ثناءاللہ کے گھر کی طرف انہیں ''کیمیا'' دینے کے لئے بڑھتے تھے۔

پیر میں موچ آجانے کی وجہ سے زبردست سوجھن آ گئی تھی اسلئے کئی دنوں سے بستر میں پڑا ہوا تھا۔ باتھ روم تک جانا بھی دوبھر ہو رہا تھا۔ چائے ناشتے کے بعد دوائیاں بھی لے چکا تھا جس سے غنودگی سی چھا جاتی تھی۔آنکھ سی لگ گئی کیا دیکھتا ہوں کہ مطاف میں

نمازِ تہجد پڑھ رہا ہوں فارغ ہو کر ایک آواز بلند ہو جاتی ہے جو چاروں طرف کے اطراف و اکناف میں پھیل جاتی ہے اور کہتی ہے کہ سونہ بھٹ کا حج قبول ہو گیا، سونہ بھٹ کا حج قبول ہو گیا، سونہ۔۔۔۔ ،بھٹ۔۔۔۔۔ ، کا۔۔۔، حج۔۔۔۔۔۔، قبول۔۔۔۔۔، ہو گیا۔۔۔۔۔۔؟"

میں انتہائی پریشان ہوتا ہوں کہ ہم نے بھی بہت اشتیاق اور بڑی محنت و مشقت سے حج کیا ہے اس کا کیا ہوا؟ لیکن فوراً ہی مجھے یاد آجاتا ہے کہ ہمارا حج سونہ بھٹ کے حج کے کئی سال بعد ہوا ہے۔

سعودی عرب کا چنل چل رہا تھا مسجدِ حرام میں نمازِ فجر پڑھائی جا چکی تھی اور فریدہ آہستہ آہستہ مجھے ہلا کر کہہ رہی تھی۔" ۔۔۔۔۔۔۔ آپ تو سو رہے ہیں۔ ابھی تو سو کر اٹھے ہیں آپ؟ آپ نے شاید سنا نہیں؟ میں یہ کہہ رہی تھی آپ سے کہ سونہ بھٹ مرحوم انتقال سے قبل آخری بار جب ہمارے ہاں آئے تھے تو آپ اس دن گھر پر نہیں تھے، سویرے ہی نکل کر کہیں گئے ہوئے تھے۔ میں نے پانی کی بوتل کھجوریں، شیرینی وغیرہ لیتے ہوئے انہیں سو کا نوٹ تھمایا تھا لیکن انہوں نے یہ کہتے ہوئے لینے سے بالکل منع کر دیا تھا کہ وہ حج بیت اللہ کا فریضہ ادا کر چکے ہیں اب انہیں اس کی مطلق ضرورت نہیں ہے کہ زندگی کے جتنے محدود دن ہیں وہ جوں توں گزر رہے ہیں۔

'سنگ باز'



میں اس پولیس چوکی کا اسٹیشن ہاوس آفیسر ہوں۔حال ہی میں تبدیل ہو کر یہاں تعینات ہوا ہوں۔ کیا پتہ، کب تک یہاں برداشت کیا جاؤں گا۔

آج آٹھ دس گبرو نوجوانوں کو، جن کے خوبصورت اور معصوم چہروں پر داڑھی ابھی پھوٹنے ہی لگی ہے، کو سنگ باری کے الزام میں گرفتار کر کے لایا گیا ہے اور حوالات میں رکھا گیا ہے۔شام سے ہی وقفے وقفے سے، چوکی میں تعینات پولیس والوں کی طرف سے، ان کی، خوب خاطر و مدارت ہو رہی ہے اور بالکل ٹھیک طرح سے ہو رہی ہے۔

اب رات کے نو بجنے والے ہیں اور میں پولیس چوکی سے ملحق ہی اپنے کمرے میں جانے والا تھا کہ حوالات کے کمرے سے مجھے کسی لڑکے کی ہچکیوں نے اپنی طرف متوجہ کر دیا، جسے حوالدار اپنے کرخت لہجے میں سمجھا بجھا رہا تھا۔حوالات کا دروازہ کھلا تھا، جاتے جاتے خبر لینے کی غرض سے میں بھی اس میں داخل ہو گیا۔

اندر ایک دس بارہ سال کا لڑکا تھا، جسے اپنے دیگر دس پندرہ سنگ بازوں کے ساتھ گرفتار کر کے لایا گیا تھا۔یہ اسی کی ہچکیاں تھیں اس کے باقی سبھی سنگی ساتھی،شام کا کھانا کھا کر سو بھی چکے تھے بس ایک یہ ہی تھا جو نہیں کھا رہا تھا اور مسلسل

روئے جارہا تھا کہ اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں، کھانے کی تھالی اب بھی اس کے سامنے ہی رکھی ہوئی تھی۔

جب اس لڑکے کی نظریں مجھ پر پڑیں تو وہ اور بھی سہم گیا اور کونے میں جیسے دبک سا گیا۔ میں نے حوالدار سے دریافت کیا۔ کیا بات ہے؟ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ وہ جواب دینے لگا کہ اس لڑکے کا نام دانش ہے، اس کے دیگر ساتھی کھانا کھا کر سو بھی گئے لیکن یہ بالکل نہیں کھا رہا ہے۔ کچھ بتاتا بھی نہیں۔

میں دانش کے اور قریب گیا اور اس سے نرم لہجے میں پوچھنے لگا۔

"دانش۔۔۔۔دیکھو گھبراؤ مت، صاف صاف بتاؤ کہ کیا بات ہے اور تمہیں کیا پرابلم ہے، اگر تمہارے دیگر دوست کھانا کھا کر سو بھی گئے ہیں تو تمہیں کیا پریشانی لاحق ہے؟"

وہ معصوم اور اشکبار آنکھوں سے میری طرف متوجہ ہو کر دیکھنے لگا لیکن ابھی تک بالکل خاموش تھا۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دوبارہ اس سے پوچھا۔ "دانش بیٹا مجھے بتاؤ کیا بات ہے میں سنوں گا اور تمہاری بات غور سے سنو گا؟ تمہیں کھانا کھانے میں کیا پریشانی ہو رہی ہے اور تم مسلسل کیوں روئے جارہے ہو، کیا بات ہے؟"

میں اب اس کے قریب ہی بیٹھ گیا تھا اور شاید اس کا بھروسہ جیتنے میں بھی کچھ حد تک کامیاب ہو چکا تھا۔

میں نے اس کے قریب ہی پڑی' کھانے کی تھالی، جواب ٹھنڈی بھی ہو چکی تھی، اس کے قریب کر دی اور اسے دوبارہ پوچھنے لگا" اسلئے نہیں کھا رہے ہو کہ کھانا بہت ٹھنڈا ہو رہا ہے؟" اس بار دانش نے سر ہلا کر نفی میں جواب

دیا۔ ''پھر کیا بات ہے؟ کھانا کیوں نہیں کھا رہے ہو؟''

دانش نے اپنے میلے کچیلے ہاتھوں سے، اپنی اشکبار آنکھوں کو مسلتے ہوئے، بڑی معصومی کے ساتھ، دھیمے دھیمے لہجے میں اور روہانسی آواز میں جواب دیا۔''

میری ممی شام کو مجھے دودھ کا گلاس دیا کرتی ہے۔ دودھ کے بغیر مجھ سے کھانا کھایا نہیں جا رہا ہے۔۔۔۔؟''

حوالات کی خاموشی میں پھر دانش کی ہچکیوں نے ایک ارتعاش سا پیدا کیا۔۔۔۔اور میں۔۔۔۔!!' اپنی نظریں کسی دوسری جانب پھیر کر، اپنی آنکھیں مسلنے لگا، بالکل ویسے ہی جیسے دانش ابھی مسل رہا تھا۔

میں نے فوراً جیب سے پچاس کا نوٹ نکال کر حوالدار کو، یہ کہتے ہوئے تھما دیا کہ فوراً باہر بازار سے دودھ اور دہی لانے کے لئے کسی کو بھیج دیا جائے۔

دانش دودھ اور دہی کے ساتھ کھانا کھا چکا تھا اور سو بھی چکا تھا اور میں۔۔۔۔۔؟ رات بھر بالکل نہیں سو سکا، نہ جانے بار بار دانش کا معصوم چہرہ اور اس کی خوبصورت آنکھیں، میری نظروں کے سامنے سے ہٹنے کا نام ہی کیوں نہیں لے رہی تھیں اور اس کی ہچکیاں، جیسے بار بار مجھ سے کچھ پوچھ رہی تھیں اور اندر ہی اندر جیسے مجھے کریدرہی تھیں، بار بار فیصل اور مصعب کی یاد بھی بہت ستا رہی تھی کہ اس بار میں کافی دنوں سے گھر نہیں جا سکا، حالات جو خراب رہے اور اب تک بھی بدستور ویسے کے ویسے ہی ہیں۔

جوں توں کر کے میں نے رات گزار ہی لی۔ صبح سویرے جب میں آفس پہنچا تو سب سے پہلے میں نے دانش کے والد کو تھانے پر بلوا لیا۔

دانش کو میں نے حوالات سے اپنے کمرے میں بلا کر اپنے سامنے والی

کرسی پر بٹھایا تھا۔ کچھ دیر بعد جب اس کا والد ڈرتا سہمتا ہوا میرے آفس میں داخل ہوا تو میں نے اسے ساتھ ہی لگی ہوئی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کردیا وہ نہ جانے کن اندیشوں میں ڈوبا ہوا ششدر و حیران ہو کر سب کچھ خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔

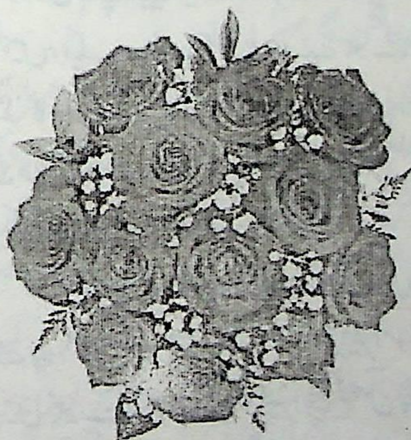
ایکدوسرے کو دیکھ کر، باپ بیٹے کی آنکھوں میں رکا ہوا سیلاب اس وقت تمام رکاوٹوں کو عبور کرتا ہوا، باندھ توڑ کر بہنے لگا جب میں نے اسے یہ جملہ سنایا کہ "منشی ابھی ضروری کاغذات لے کر آرہا ہوگا اس کے بعد تم دانش کو اپنے ساتھ گھر لے جاسکتے ہو"، لیکن تمہیں یہ لکھ کر دینا ہوگا کہ دانش آئندہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟۔

دونوں باپ بیٹے ایک دوسرے سے لپٹ کر اسطرح رونے لگے جیسے انہیں ایک رات نہیں، ایک صدی باہم ملے ہوئے ہوگئے تھے۔ باپ کی یہ حالت تھی اور ماں۔۔۔۔۔؟، کا کوئی نعم البدل نہیں، اس نے یہ رات کیسے گزاری ہوگی اور دانش کے دودھ کے گلاس کا۔۔۔۔۔۔۔۔؟۔ اسی دوران منشی نے دانش کے والد سے کاغذات وغیرہ سائن کروالئے۔

ابھی میں کچھ اچھی اچھی اور سنگ باری سے نفرت دلانے والی نصیحتیں کر کے دروازے پر انہیں وداع ہی کر رہا تھا کہ میرا موبائل بجنے لگا۔ گھر سے میری بیگم روہانسی آواز میں مجھ سے مخاطب تھی کہ میرا بیٹا فیصل پتھر بازی میں شدید زخمی ہو کر مقامی اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں داخل ہے اور میرا دوسرا بیٹا مصعب 'سنگ بازوں' کے ساتھ گرفتار ہو کر، اپنے کئی دوستوں کے ساتھ' مقامی پولیس تھانے میں بند ہے۔ کسی تاخیر کے بغیر ہی، میں ضروری لوازمات پورے کر کے، اپنے گھر کی طرف بھاگنے لگا۔

کچھ دن بعد، میں دوبارہ تھانے میں داخل ہو کر اپنی ڈیوٹی پر آگیا۔ آتے ہی میں نے اپنے اسٹاف ممبروں کو غیر متوقع طور پر قدرے خوش پایا۔ میں

ابھی اسی مخمصے میں تھا کہ کیا بات ہو سکتی ہے؟ جب میں اپنی کرسی پر بیٹھ گیا تو میں نے اپنے ٹیبل پر، پچھلے دو مہینوں میں، تیسرے ٹرانسفر آرڈر کو اپنا منتظر پایا۔





تین داس اور ایک داسنی

میں ان کشمیریوں اور جمویوں کے بیچ گئی

برسوں سے کام کررہا ہوں یہ بات درست ہے کہ میں ان کے درمیان اپنے آپ کو، گونگا اور بہرا سا محسوس کررہا ہوں اور یہ بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ میں ان کی زبان بالکل نہیں سمجھ پارہا ہوں حالانکہ ایسا بالکل نہیں ہے میں اگر ان کی زبان لکھ پڑھ اور بول نہیں سکتا ہوں لیکن اسے اچھی طرح سے سمجھ سکتا ہوں۔ یہاں تک کہ سخت محاوروں تک کو بھی ، کہ میں نے لگ بھگ تیس برس سے بھی زیادہ عرصہ انہی گلیوں اور کوچوں کے چکر کاٹ کر گزارے ہیں جن میں یہ زبانیں بولی سمجھی پڑھی اور لکھی جاتی ہیں وہ بھی اپنی زندگی کے بہترین ماہ وسال جب انسان ابھی لڑکپن میں ہی ہوتا ہے یا پھر نوجوانی میں جب اس کا دماغ وذہن تروتازہ اور زرخیز ہوتا ہے اور کچھ سیکھنے سمجھنے کے لئے بالکل تیار و مستعد بھی۔

لداخ کے ایک متوسط گھرانے سے میرا تعلق ہے

جوں توں کر کے پڑھائی مکمل کرلی قسمت اچھی تھی کہ سول سروس میں منتخب ہوگیا اور
سیکرٹریٹ میں میرا ابتدائی جاب لگ گیا۔ ابتدا سے ہی یہ طے کرلیا تھا اور کچھ کچھ یہ
میرے خمیر میں بھی شامل تھا کہ میں تن دہی اور ایمان داری کے ساتھ کام کرتا رہوں اور آخر
تک اسی پر قائم بھی رہوں۔

ہزاروں مرحلے آئے، نفس پرستی اور حرص وہوس کو اپنے اوپر غالب نہیں آنے دیا اور
نہ ہی اپنی غیرت وعزت کو بیچ ڈالا۔ ہر پڑاؤ پر سنبھل سنبھل کر قدم رکھنے کی عادت سی پڑ گئی
۔شاید اسی عادت کی بدولت اب تک ان تمام خرابیوں سے محفوظ ہوں جن میں میرے عہد
ے پر فائز اکثر میرے جیسے لوگ مبتلا دیکھے جاسکتے ہیں۔

ملازمت کے دوران لاتعداد نشیب وفراز سے گزرنا
پڑا۔ اچھے برے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہی رہتا ہے۔ یہ سلسلہ تب تک جاری رہا جب تک
ملازمت رہی اس کے بعد ایک ہی جگہ پر ٹکے ہوئے ہوں نہ کہیں آنا اور نہ کہیں پر جانا
ہے۔ بس اپنے ہی کام میں مصروف اور اپنی ہی دھن میں مست ومگن۔۔۔؟

اب کئی دہائیاں ہوگئیں لاتعداد ناقابلِ فراموش واقعے رونما
ہوگئے۔ جن کا میں بہ نفس نفیس گواہ ہوں جنہیں یاد کر کے آج بھی کبھی جیسے سارے شریر
میں جھرجھری سی محسوس ہوتی ہے اور جیسے کرنٹ سا لگ جاتا ہے۔ کچھ واقعات عمر بھر ان
کہے بھی رہ جاتے ہیں کہ انہیں کسی کے ساتھ شئر بھی نہیں کیا جاسکتا۔۔۔۔۔؟ یہاں تک
کہ اپنے خاص الخاص لوگوں کے ساتھ بھی۔۔۔۔۔، بس اندر ہی اندر جذب کرنے
پڑتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے گرم ریت پانی کو جذب کرتی ہے۔

زندگی شاید اسی کا نام ہے کہ جن چیزوں کی بالکل
عادت ہی نہیں ہوتی انہی کی عادت ڈالنی پڑتی ہے اور ایک نئی ہی دنیا آباد کرنی پڑتی
ہے۔ جو ابتداء میں بالکل اجنبی نامانوس اور غیر سی محسوس ہوتی ہے اور پھر وقت گذرنے

کے ساتھ ساتھ اس کی بھی عادت سی پڑ جاتی ہے بالکل ایسے جیسے ابتداء سے ہی سب کچھ ایسے ہی تھا۔

میں اپنے دیگر احباب کی طرح بھی نہیں ہوں جو ایک پٹاخے کی طرح ہی، ماچس کی جلتی ہوئی تیلی لگتے ہی، ریٹائرمنٹ کے بعد، پھٹ پڑتے ہیں اور پاس پڑوس کی ہر ایک چیز کو بھی اپنی طاقت و بساط کے مطابق ہی، لرزہ براندام کر دیتے ہیں۔ بیروکریسی سے فارغ ہو کر ہی اپنی خودنوشت لکھنے بیٹھتے ہیں اور وہ وہ انکشافات کر دیتے ہیں کہ چاروں طرف سنسنی سی پھیلا دیتے ہیں الگ الگ انٹرسٹ کے لوگ کہاں موجود نہیں ہوتے، انہیں گھاس ڈالنے والا کوئی نہ کوئی مل ہی جاتا ہے۔لیکن ہم جیسے لوگ۔۔۔۔۔۔؟ اور ہمیں، اندر ہی اندر۔۔۔۔۔۔۔۔کریدتی ہوئی ہماری،۔۔۔۔۔یہ یادیں، جنہیں ہم عمر بھر اپنے ساتھ رکھکر، اپنے ساتھ ہی یہاں سے لیجاتے ہیں یا پھر دفنا دیتے ہیں۔

پچھلے کئی دنوں سے نہ جانے کیوں لتاجی کا واقعہ بار بار مجھے یاد آرہا ہے۔لتاجی آج بھی پالیٹکس میں ہی ہے لیکن آج وہ منتری نہیں ہے۔اچھے گھرانے سے تعلق ہے اور اچھی پڑھی لکھی خاتون ہے۔شوہر ایک اچھے عہدے سے ریٹائر ہو چکے ہیں۔سب کچھ میسر ہے۔عزت دولت، شہرت، کسی چیز کی کوئی کمی نہیں ہے۔ ان دنوں یونہی کوئی چالیس برس کی رہی ہونگی۔اپنے آپ کو Maintain رکھنے کا ہنر انہیں خوب آتا تھا اور جنہیں یہ فن آتا ہے، ڈھلتی عمر کا گرد و غبار ان کی شخصیت کے آئینے کو دھندلا نہیں کر پاتا۔ بہت دنوں سے ریٹائرمنٹ کے بعد سے ،لتاجی سے نہیں ملا ہوں پالیٹیکس میں ابھی تک رہنے کی وجہ سے آج بھی وہ سرگرم سیاست میں نظر آتی ہیں اور بالکل ویسی کی ویسی ہی دکھ رہی ہے۔لگ بھگ دو تین دہائیوں کا وقفہ گذر جانے کے باوجود بھی لتاجی کے جسمانی خدو خال میں کوئی خاص فرق نہیں آیا

ہے۔ریٹائرتو ہم سرکاری نوکر ہوجاتے ہیں سیاست داں مرتے دم تک ریٹائرنہیں ہوتے۔اسلئے بوڑھے بھی ہم ہی ہوجاتے ہیں۔

بھگوان داس بھی منتری ہی تھے۔شکل وصورت ------؟بس قابلِ گوارہ تھی لیکن سیاسی قدوقامت کا کیا کہنے؟سب سے آگے اور اونچے تھے۔شاید اسلئے کہ برسرِ اقتدار مطلق العنان خاندان کے داماد تھے۔بڑے ہی تیز و تند مزاج والے،سخت گیر اور تلخ زبان۔ان کی ایمانداری کے چرچے بھی عام تھے ان کے بارے میں یہ بات بھی مشہور تھی کہ بڑے عبادت گزار ہیں،راتوں میں،جاگ کر دھیان میں لگے رہتے ہیں اور عبادت میں مشغول ومحو رہتے ہیں۔باقی عادات تو مجھے پسند نہ تھے البتہ اس اک عادت کی وجہ سے میں ان کی کافی عزت و تعظیم کرتا تھا۔آٹھ دس سال قبل سب کچھ یہیں پر چھوڑ کر،پرلوک سدھار گئے۔

دیوی داس جی بھی منتری تھے۔شکل وصورت سے بھی اچھے تھے ایماندار اور پڑھے لکھے تھے اور ایک اچھے خاندان سے ان کا تعلق تھا۔اپنی اصل زندگی میں بھی دیویوں کے داس تھے۔ان کی دیگر عادتیں ٹھیک ہی تھیں لیکن یہ والی عادت میرے حساب سے ٹھیک نہیں تھی،آج نہیں ہیں۔آٹھ دس سال قبل ان کا بھی---------؟

یہاں تک پہنچتے پہنچتے دو داس اور ایک داسی ہو گئے اور اب تیسرے داس کی بھی سنئے ----------؟!یہ میں ہوں ---، ہاں،ہاں میں ---،ان تینوں کا داس---،سیکرٹریٹ میں ملازم تھا،جسے دوسرے الفاظ میں بیروکریٹ بھی کہا جاتا ہے۔یہ تینوں اس وقت منتری تھے اور ان کی سیاسی پارٹی برسر،اقتدار تھی میں سرکاری ملازم تھا اسلئے ان تینوں کا داس تھا،آپ مجھے غریب داس کہہ سکتے ہیں،ہاں غریب داس،روزروز ان سے ملنا،ان کا ڈکٹیشن لینا،ان کے حکم کی تعمیل کرنا

اور اپنی رائے دینا وغیرہ یہی سب کچھ تو میری ڈیوٹی تھی، میرا فرض منصبی یا دفتری لوازمات بھی کہہ سکتے ہیں، اسی سب کے لئے تو میں تنخواہ لے رہا تھا۔

میرے سب آفسر ویسے مجھ سے خوش تھے اور میں بھی اپنی دفتری زمہ داریوں سے مطمئن وخوش تھا۔

ایک دن یوں ہوا کہ، بھگوان داس اور دیوی داس باتوں باتوں میں ایک دوسرے کے ساتھ اسطرح مصروف و مشغول اور آپس میں گھل مل گئے تھے کہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟؟!!۔

دونوں داس یقین کی حدتک اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ میں لداخی غریب داس، کشمیری بھگوان داس اور جموی دیوی داس کی گفتگو نہیں سمجھ پا رہا ہوں۔ میں بظاہر اپنے لیپ ٹاپ پر بہت مصروف ومشغول تھا یا پھر مصروف ومشغول ہونے کی ایکٹنگ کر رہا تھا کہ میرے تمام حواس خمسہ ان کی اس رازدارانہ گفتگو کی طرف ہی متوجہ تھے۔ اسمبلی کا سیشن چل رہا تھا اور میں مختلف محکمانہ انکوائریز کے سلسلے میں آنے والے جوابات کو ڈاون لوڈ کر رہا تھا تا کہ ان کا پرنٹ نکال کر منتری صاحبان کو تھمادوں اور کل کے اسمبلی اجلاس میں یہ اپوزیشن کی طرف سے اٹھائے گئے سوالات کا جواب اطمنان کے ساتھ دے سکیں اور حزب اختلاف کے شور شرابے اور ہنگامہ آرائی کو کچھ کم کر سکیں۔ لیکن اندر ہی اندر میں ان دو داسوں کی گفتگو سننے اور بڑی باریکی کے ساتھ اس کا تجزیہ کرنے میں مصروف تھا۔ اسی دوران میری سماعتوں سے یہ باتیں ٹکرائیں ۔۔؟!

دیوی داس۔۔۔۔ یا دیویوں کے داس۔۔۔۔ بھگوان داس سے۔۔۔ بڑے رازدارانہ لہجے میں۔۔۔۔۔ کہہ رہے تھے۔۔۔ کہ۔۔۔ لتا جی۔۔۔ کے دہن سے۔۔۔۔۔ انہیں۔۔۔۔۔ ہر بار۔۔۔۔ بدبو۔۔۔ آتی ہوئی محسوس ہوتی ہے ۔۔۔۔۔ بھگوان داس۔۔۔۔۔ چونک کر ۔۔۔۔۔ ان کی

---طرف---- دیکھتے ہوئے---- کہنے لگے کہ ان کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ کہ انہوں نے بھی ہر بار ایسا ہی محسوس کیا۔

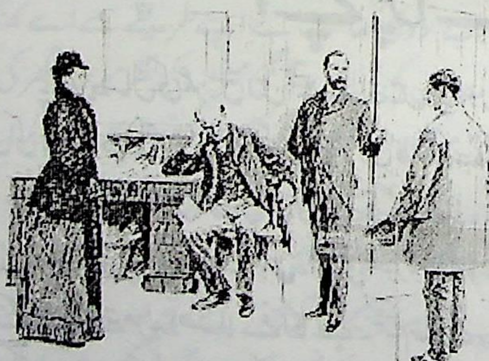
میں حیران و ششدر رہ گیا کہ لتاجی کے زیادہ آس پاس میں ہی ہوتا ہوں، دفتری معاملات پر غور وخوض کرنا، مختلف فائلوں پر تحریر شدہ ضروری نوٹس انہیں سنانا اور ان پر ان سے آڑر لے لینا اور پھر ان سے ڈکٹیشن لے لینا وغیرہ۔

یہ دونوں بوڑھے منتری بظاہر سیکرٹریٹ اور پارٹی میٹنگوں میں ان سے دور ہی ہوتے ہیں پھر بھی انہیں ہر بار-----، لتاجی کے منہ سے بدبو کیسے محسوس ہوتی ہے------؟؟!!

کچھ دیر بعد یہ بات خود بہ خود میری سمجھ میں آ گئی اور میں اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ نہ میری سونگھنے کی حس میں کوئی نقص یا خرابی ہے اور نہ ہی ان دو ادھیڑ بوڑھے عمر کے دیوی داسوں کی سونگھنے کی حس ہی کتوں جیسی ہی تیز اور بڑھی ہوئی ہے؟ انسانوں کی سونگھنے کی حس سے کئی گنا زیادہ اور حساس-----؟ میں حیران و ششدر رہ گیا اور میرے پاؤں تلے جیسے زمین کھسک گئی۔ میرے روم روم میں ان سیاست دانوں کے خلاف شدید نفرت سی پیدا ہو گئی اور ان کے متعلق تمام خود ساختہ بت مسمار ہو کر دھڑام سے نیچے گرنے لگے۔ جس سے ایک ارتعاش سا پھیلنے لگا۔

دل بدلو سیاست دانوں کی، موجودہ حکومت کو گرانے کا عمل خفیہ طور پر شروع ہو چکا تھا چہ مے گوئیاں کچھ اخبارات اور سیاسی حلقوں میں پہلے ہی سے چل رہی تھیں۔ اسمبلی سیشن ختم ہوتے ہی سیاسی اتھل پتھل اور سیاست دانوں کے جوتوں کی طرح ہی وفاداریاں بدلنے سے، تختہ الٹ دیا گیا اور اب بھگوان داس تخت نشین ہو گئے تھے اور دیوی داس ان کے خاص الخاص ایلچی، مشیر، دست راس اور سینئر وزیر بن چکے تھے۔ لتاجی بھی ان دونوں کی مہربانیوں کی وجہ سے کہاں سے کہاں پہنچ گئی تھی-------، اور غریب داس

نے۔۔۔۔۔۔، اپنے لئے۔۔۔۔۔۔۔، چودہ برس کے بن باس کا۔۔۔۔۔، انتخاب کرلیا تھا۔ وہ سیکرٹریٹ کے ایک کونے میں ۔۔۔۔۔۔۔، ایک سیل میں ۔۔۔۔۔۔، ایک بیکار پوسٹ پر۔۔۔۔۔۔، تعینات یا قید ہو گیا تھا، جہاں نہ کسی کا آنا جانا ہی تھا اور نہ ہی کسی سے کوئی میل ملاپ ہی، یہاں تک کہ چودہ برس کے بعد اس کے ریٹائرمنٹ نے اسے، اس جیل سے رہائی دلادی۔





اپنے پرائے

پانچ چھ سال کی عمر میں اس یتیم خانے میں آیا ہوں اور آج میری عمر یہی کوئی بارہ تیرہ سال کی ہوگی ویسے بھی ہم جیسے لوگوں کی عمروں کا حساب کون رکھتا ہے؟

مجھے خود بھی یاد نہیں کہ میں یہاں کیسے آ گیا تھا۔ والدین کی شکل وصورت بھی ٹھیک طرح سے یاد نہیں ہاں ہلکا ہلکا سا عکس، ان کی صورتوں کا ذہن میں موجود ہے جو وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ مزید دھندلانے لگا ہے۔ یتیم خانے کے ریکارڈ میں درج نہ ہوتا تو شاید مجھے یہ بھی پتہ نہ ہوتا کہ میں خواجہ اکرام الدین اور فاطمہ بی بی کی اکلوتی اولاد ہوں۔

آج بھی وہ منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے تو۔۔۔۔۔۔۔؟! جب ہماری بستی خاک وخون میں نہلائی تھی اور پوری کی پوری بستی جہنم جیسی آگ میں جھلسادی گئی تھی اور بھاگنے والوں پر نشانہ سادہ کر بے تحاشا گولیاں برسائی گئی تھیں۔ اسی معرکے میں میرے والدین بھی کام آگئے تھے اور ان کی خاک وخون میں لت پت لاشیں دیر تک بہت بچوں

بوڑھوں نوجوانوں اور عورتوں کے ساتھ سڑک پر پڑی رہی تھیں۔ میں اس لئے بچ گیا تھا کہ میں صبح سویرے وہاں سے دو تین کلومیٹر دور اسکول چلا گیا تھا۔

اس سانحے کے بعد مجھے والدین کے ایک دور کے رشتہ دار نے کچھ وقفہ تک اپنے گھر میں پناہ دی تھی لیکن بالآخر میں اس یتیم خانے میں پہنچ گیا جہاں میرے ساتھ میرے ہی جیسے میرے دیگر دوست بھی ٹھہرے ہوئے ہیں اور زندگی گذار رہے ہیں۔

اس یتیم خانے میں پرورش پانے والے لگ بھگ سو کے قریب یہ بچے ہی اب میرے دوست، بھائی اور رشتہ دار ہیں۔ یہ مجھے جانتے ہیں اور میں انہیں۔ ایک دوسرے کے علاوہ ہم اور کسی کو نہیں جانتے ہیں۔ خاص کر میں، میں صرف اپنے ایک رشتہ دار کو جانتا ہوں۔ کئی برس گذر گئے ایک دن ایک ادھیڑ عمر کی خاتون مجھے تلاش کرتے ہوئے یہاں تک آ گئی تھی میں اسے نہیں جانتا تھا اپنے آپ کو میری قریبی رشتہ دار جتلا رہی تھی۔ پھر جب مولوی صاحب نے اپنے طریقے سے اسے کھنگالا تو باتوں باتوں میں اصل مقصد کی بات اس کی زبان پر آ گئی محترمہ کی نظر میرے گھر کی زمین پر تھی جسے وہ ہڑپ کرنا چاہتی تھی۔ مولوی صاحب نے کئی بار استغفر اللہ پڑھ کر اسے رخصت کرلیا۔ مولوی صاحب ہی کی زبان سے سن چکا ہوں کہ اسی طرح کے میرے کچھ رشتہ دار ہمارے نام آنے والی امداد بھی ہضم کر چکے ہیں۔

ماں باپ شہید ہو کر یتیم بنا کر چھوڑ گے تھے اور یہ نام نہاد رشتہ دار کنگھال بنانے پر تلے ہوئے تھے۔ مجھے اب یاد بھی نہیں کہ ہمارا کوئی گھر یا اور کوئی ٹھکانہ بھی تھا۔ بلکہ ایسا لگ رہا ہے کہ یہ یتیم خانہ ہی ہمارا گھر، ہمارا آشیانہ ہے ہمارا مدرسہ، ہماری وراثت ہماری جائیداد ہے اور یہ مولوی صاحب ہی ہمارے سب کچھ ہیں۔؟!

الطاف اور میں لگ بھگ ایک ہی عمر کے ہیں۔ اور تقریباً ایک ساتھ ہی یہاں اس گھر میں آئے ہیں۔ میں اس سے اور وہ مجھ سے اپنے دکھ درد بانٹتا ہے ایک ساتھ

روتے بھی ہیں اور ہنستے بھی، ہنستے کہاں ہیں؟ ہمارے لئے ہنسنا منع ہے لاکھ کوشش کرنے کے باوجود بھی ہنسی کیا تبسم یا مسکراہٹ بھی ہمارے ہونٹوں پر نہیں آتی۔

اس کی ماں کبھی کبھی اس سے ملنے کے لئے یہاں آجاتی ہے بہت اچھی خاتون ہے وہ، مجھے بھی اپنے بیٹے ہی جیسا پیار دیتی ہے۔ الطاف اور میں بس اسے جانتے ہیں یا پھر اس یتیم خانے کے مہتمم مولوی صاحب کو، اور کسی کو نہیں؟۔

الطاف اور میں عمر کی اس حد کو چھو گئے ہیں جہاں پہنچ کر، یہاں پلے بڑھے ہر بچے کو اس دیرینہ گھر کو چھوڑنا پڑتا ہے یہی یہاں کا دستور ہے یہاں کا قاعدہ اور قانون ہے۔

الطاف تو اپنی ماں کے ساتھ جائے گا۔لیکن میں کہاں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟؟!!۔

الطاف کی ماں سارہ آپا مجھے کئی بار الطاف کے ساتھ ان کے گھر آنے کے لئے کہہ گئی ہے لیکن وہ گھر خود الطاف کے لئے بھی ایک اجنبی گھر ہے اس کے سوتیلے والد کا، میرے لئے تو۔۔۔۔۔۔؟!

الطاف اور میں اکیلے بیٹھے ہوئے دھوپ سینک رہے تھے مجھ سے رہا نہ گیا ایک لمبی آہ کھینچ کر میں نے آخر الطاف سے کہہ ہی دیا

"الطاف بہت جلد تم اپنی ماں سارہ آپا کے ساتھ اپنے گھر جاؤ گے مجھے بھی اس گھر کو چھوڑنا ہوگا کیا پتہ میری قسمت اب مجھے کہاں لے جائے پتہ نہیں ہم دونوں اب دوبارہ ملینگے بھی یا نہیں؟ تمہاری ماں۔۔۔ تجھے لینے کے لئے۔۔۔۔آئیگی۔۔۔۔میرا اس شہر میں۔۔۔ کون ہے۔۔۔ جو مجھے۔۔۔۔لینے آئے گا۔۔۔۔۔۔؟!" اس کے بعد میں خاموش ہو گیا۔ رندھی ہوئی آواز اور بھیگی ہوئی آنکھوں کے ساتھ، تکلم جاری نہ رکھ سکا۔

الطاف بہت حساس ہمدرد اور بے لوث محبت کرنے والا تھا۔ اخلاص و محبت کے دو بول کی قدر و قیمت اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ خود بھی ان مراحل

سے گذر چکا تھا اور گذر رہا تھا جن سے میں گذرا ہوں۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور مجھے گلے سے لگا کر ایسے رونے لگا جیسے میرا دوست نہیں میرا سگا بھائی ہو۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟!

ہم دونوں ہی زار و قطار رونے لگے کہ ہچکیاں بندھ گئی۔ پھر ذرا ہم سنبھل گئے تو ایک دوسرے کو تسلی دینے لگے۔ بہت زور دے رہا تھا کہ میں اس کے ساتھ ہی اس کے گھر میں اس کے ساتھ رہوں۔ لیکن میں۔۔۔۔۔؟! میرے دل میں نہ جانے کتنے وسوسے اور واہمے پل رہے تھے جن کا کوئی تسلی بخش جواب میرے پاس نہیں تھا۔

بالآخر وہ دن آہی گیا ہمارے بچھڑے کا دن، سب ضروری تیاری ہو گئی سامان باندھ دیا گیا۔ مولوی صاحب نے ہمیں کچھ تحائف وغیرہ بھی دئے اور ڈھیر ساری دعاؤں کے ساتھ کچھ اچھی اچھی نصیحتیں بھی۔

کل صبح سارہ آپا ہمیں اپنے ساتھ لیجانے کے لئے آجائے گی۔ الطاف کہیں چلا گیا تھا۔ ایک مفصل خط الطاف کے نام چھوڑ کر، مولوی صاحب سے یہ کہکر رخصت ہو گیا کہ قریب ہی ایک دوست سے ملنے کے لئے جا رہا ہوں۔

راستے میں اپنے آبائی مقبرے پر اتر کر والدین کی قبروں پر فاتح خوانی کے لئے، ذرا دیر کے لئے ٹھہرا۔ عیدین اور شب برات پر میں اکثر یہاں آیا جایا کرتا تھا۔ یہاں پہنچتے ہی مجھے ایک عجیب احساس نے گھیرا ایسا لگ رہا تھا جیسے میں آج دوبارہ یتیم ہو رہا ہوں خود بخود میری آنکھوں سے آنسوں کا سیلاب سا۔۔۔۔۔۔؟!۔

میں ابھی اس حالت سے پوری طرح نہیں ابھرا تھا کہ میں نے اپنے شانوں پر کسی کے دستِ شفقت کو محسوس کیا اور اس کے ساتھ ہی کسی بزرگ کی مشفقانہ آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے نم دیدہ آنکھوں سے پیچھے کی طرف دیکھا۔ ایک پر وقار بزرگ شخص، سفید لمبی داڑھی، سر پر سفید عمامہ پہنے ہوئے کوئی نورانی چہرے والا شخص مجھ سے بڑی اپنائیت کے ساتھ سوال کر رہا تھا۔ "بیٹے آپ کون ہو۔۔۔؟ اور

یہاں خواجہ اکرام الدین کی قبر پر کیا کر رہے ہوں؟! آپ ان کے کیا لگتے ہو؟!''۔
میں نے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے جواب دیا۔ ''میرا نام عمران ہے۔
میں ان دو مرحومین کا فرزند ہوں۔ ان کی فاتح خوانی کے لئے گاہے بگاہے آتا رہتا ہوں۔
میرا یہ کہنا تھا کہ اس بزرگ شخص نے مجھے گلے سے لگالیا اس کے بعد میں نے اس بزرگ کی رندھی ہوئی یہ آواز بار بار سنی ''بیٹے یقین نہیں آرہا ہے کہ تم واقعی خواجہ اکرام الدین اور فاطمہ بی بی کے بیٹے ہو؟!''

اب ہم اس مقبرے سے نکل آئے تھے اور اس بزرگ کے کافی اصرار پر ان کے گھر کی طرف بڑھ رہے تھے میں ابھی تک ان کی مکمل شناخت کے بارے میں مخمصے میں تھا اور وہ مجھے اپنے اندر کی باتیں سنا رہے تھے کہ ''اللہ بڑا کارساز اور مسبب الاسباب ہے اس نے مجھے تم سے ملا دیا''

میں حیران تھا کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے؟ راہ چلتے چلتے بزرگوار نے ایک مسجد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ وہ اس مسجد کے امام ہیں اور ان کا گھر بس مسجد کے قریب ہی ہے۔

جوں توں کر کے ہم ان کے گھر پہنچے اور میں اپنا مختصر سا سامان اٹھا کر ان کے گھر میں داخل ہو گیا جو بہت ہی شاندار اور بڑا بڑا اور صاف ستھرا گھر تھا۔ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد ہی ناشتہ اور چائے وغیرہ لے کر ایک بزرگ خاتون آ گئی جس نے آتے ہی مجھے گلے سے لگالیا اور چومتے ہوئے کہنے لگی تم واقعی فاطمہ بیٹی کے بیٹے ہو مجھ سے قرآن شریف پڑھا کرتی تھی؟۔ یقین نہیں آتا۔ مرحومہ کی شکل وصورت بالکل آنکھوں کے سامنے ہے اللہ مغفرت کرے؟۔''

دیر تک باتیں ہوتی رہیں کچھ انہوں نے سنائیں اور کچھ میں نے۔ بیچ بیچ میں آنکھیں بھی بھر آتی تھیں۔ ماضی کی سبھی یادوں سے پردہ کھسکنے لگا۔ بہت باتیں میرے لئے

نئی اور حیران کن تھیں اور کچھ باتیں ان کے لئے بھی ایسی ہی تھیں۔

اس کے بعد امام صاحب ذرا توجہ سے میری طرف یوں مخاطب ہو گئے۔ ''بیٹا ایسا ہے تمہارے والدین کا جو قطعہ اراضی یہاں مارکٹ میں تھا جس پر ان کا مکان بھی بنا ہوا تھا جو اس خاک وخون والے سانحے کی نذر ہو گیا، بالکل تمہارے والدین کی طرح ہی، اس پر کئی لوگوں کی نظریں تھیں اس کو محفوظ بنا کر اس کے اکلوتے وارث کے سپرد کرنے کے لئے محلے کے خداترس حضرات نے اسے میری تحویل میں دیا تھا اور میں اس فکر میں تھا کہ کب اسے اس کے اصل وارث تک پہنچادوں اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے وہ مجھے آج مل بھی گیا۔ آگ وآہن کے اس کھیل کے بعد ملنے والی امدادی رقم سے کچھ دکانیں بھی بنادی گئی تھیں جن کا اب تک کا کرایہ بینک میں جمع ہے جس سے مزید کچھ دکانیں اور ایک چھوٹا سا گھر بھی تعمیر ہو سکتا ہے جب تک یہ کام بخیر وخوبی انجام پائے تب تک تمہارا قیام ہمارے ہاں ہی رہیگا۔ یہ ہمارا فیصلہ ہے جو تمہیں ماننا ہو گا گھر مکمل طور پر بن جانے کے بعد تم اپنی مرضی کے خود ہی مالک ہو نگے۔

اس دوران نوکر نے میرا مختصر سا سامان ساتھ والے کمرے میں منتقل بھی کر لیا تھا۔





ماں۔۔۔؟

امین بھائی میں آنسوؤں میں کس لئے تربتر ہوں؟ سنو گے تو شاید پتہ چل جائے گا کہ سیٹھ بیسٹھ سال کا بوڑھا آدمی اپنے آنسوئں سے اپنی سفید برف سی داڑھی نمکین پانی سے کیوں بھگو رہا ہے؟۔

آج صبح ایک پڑوسی انتقال کر گئے تھے۔ ہمارے آبائی قبرستاں سے گذر کر ہی ان کا مقبرہ تھا۔ والدہ محترمہ کے کتبے پر نظر پڑی تو حیرانی ہوئی کہ نو سال انہیں گذرے ہوئے ہو گئے ہیں جیسے کل ہی کا واقعہ ہو! وقت کیسے گذر گیا کچھ پتہ ہی نہیں چلا؟۔ ان کے انتقال سے ذرا قبل کا ایک واقعہ یاد آ گیا تو ان کمزور بینائی والی آنکھوں سے نمکین پانی کی دھارسی بہنیں لگی اور بہتی ہی رہی کہ پوری سفید داڑھی بھیگ گئی۔

اس دن موسم بہت خراب تھا دو تین روز سے مسلسل پریشان کرنے والی تیز و تند اور ڈراونی طوفانی ہوائیاں چل رہی تھیں جو رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں اور ہمارے نئے مکان کی چھت پر ٹین کی ایک چادر تین طرف سے کھل گئی تھی صرف ایک سرے سے بندھی ہوئی تھی کہ ہر ایک ہوا کے جھونکے سے اوپر اٹھ کر نیچے گر کر شدید شور شرابا بپا کر رہی تھی اور یہ سلسلہ رات بھر جاری رہا کہ رات بھر پاس پڑوس میں رہنے والے پڑوسی بھی سہم سے جاتے تھے اور والدہ کچھ زیادہ ہی پریشان ہو رہی تھی۔

ہمارا نیا مکان، ہمارے پرانے مکان سے، جہاں ہم رہ رہے تھے ایک آدھ کلومیٹر کی مسافت پر تھا اور والدہ محترمہ میرے نئے مکان کے ساتھ والے بھائی صاحب کے گھر میں رہتی تھیں۔

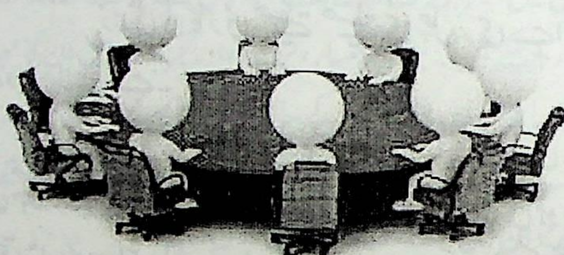
میں اس وقت طوفانی ہواؤں کے دوران ہی چھت پر انتہائی ابتر اور پریشان کن حالات میں تین اطراف سے نکلی ہوئی ٹین کی چادر کو اسکریو سے کس رہا تھا جب والدہ کسی کے موبائل سے مجھے فون کر رہی تھی یہ بتانے کے لئے کہ ٹین کی چادر متواتر ہواؤں سے کھل گئی ہے۔ میں نے ہاں ہوں میں جواب دیا اور یہ بھی بتایا کہ میں وہیں چھت پر ہی ہوں اس واقعے کے کچھ دن بعد ہی بھائی صاحب نے مجھے والدہ محترمہ کی اچانک علالت کی خبر دے دی۔

میڈیکل انسٹچوٹ کے انتہائی نگہداشت والے وارڈ کے بیڈ پر پڑی ہوئی والدہ محترمہ کے بارے میں، میں ہی نہیں سب لوگ حیران تھے کہ کل یہاں خود پیدل چل کر آنے والی ہماری والدہ کے اچانک گردے کیسے فیل ہو گئے اور پھیپھڑوں نے کیسے کام کرنا بند کر دیا؟ اور دل۔۔۔۔۔۔؟ کل تک تو یہ ٹھیک ٹھاک ہی تھی۔

میں اور بھائی صاحب بڑی مستعدی کے ساتھ اس کے دائیں بائیں بیٹھے رہے اور ہم نے پوری رات ایسے ہی گذاری۔ زندگی اور موت، وجود اور عدم کی لڑائی لڑتے ہوئے

صرف اس کے چہرے کو بڑی بے بسی کے ساتھ تکتے رہے اور کر بھی کیا سکتے تھے؟ یہاں تک کہ قریبی مساجد سے فجر کی اذان آنے لگی۔ میں بھائی صاحب سے کہہ کر وضو کرنے کے لئے ابھی باہر آیا ہی تھا کہ موبائل پر بھائی صاحب نے گھبرا کر مجھے فوراً واپس بلا لیا۔ بھاگا دوڑا جب میں واپس آیا تو والدہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ملکِ عدم کی طرف پرواز کرنے کے لئے پر تولنے لگی تھی۔

نو سال گذر گئے والدہ محترمہ کو وفات پائے ہوئے۔ نمازوں کے بعد ہر وقت جب اس کی یاد آجاتی ہے تو یہ آنکھیں بھیگ جاتی ہیں کہ ماں باپ کا کوئی نعم البدل نہیں۔ بار بار یہ سوال ذہن و دل میں پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہمارے لئے بھی کل کوئی اسی طرح دعا کرتا رہے گا جب ہم۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟



الگ الگ پیمانے سب کے

جن کچھ چیزوں کے بارے میں انسان باخبر نہیں ہے ان میں رزق بھی ایک ہے مقدر میں رزق کے دانے کہاں کہاں بکھرے پڑے ہیں کسی کو کچھ خبر نہیں ہے۔ انسان اپنے حصے کے رزق کے دانے سمیٹنے میں کہاں کہاں نہیں پہنچتا اور کس کس در کی ٹھوکریں نہیں کھاتا اور جب وہ اٹھ جاتے ہیں تو پھر۔۔؟

اس ادھیڑ عمر میں بھی مجھے کشمیر سے، اتنا لمبا اور تھکا دینے والا سفر کر کے کولکتہ جانا پڑتا ہے کہ میرے رزق کے دانے وہیں پر بکھرے پڑے ہیں جہاں سردیوں کے موسم میں، میں انہیں سمیٹ کر لاتا ہوں اور سال بھر زندہ رہنے کے لئے اپنا گذارہ چلا لیتا ہوں اور یہ عمل نوجوانی کے ایام سے ہی جاری ہے اور شاید زندگی کے اختتام تک جاری ہی رہیگا۔ بیٹے بیٹیاں گھر گرہستی سب اسی سے

چلتا ہے اور اب ڈھلتی ہوئی عمر کے تقاضوں کو دیکھتے ہوئے اتنی سخت محنت ومشقت کا متحمل بھی نہیں ہوسکتا ہوں لیکن کیا کریں مجبوری جو ٹھہری کہ زندگی کی ضروریات کا لامتناہی سلسلہ وسیع سے وسیع ہوتا جارہا ہے اور آمدنی کے وسائل وہی محدود کے محدود۔ پھر بھی اوپر والے کا کرم ہے کہ جوں توں کر کے یہ سلسلہ یونہی جاری اور قائم ودائم ہے۔

زندگی کی گاڑی گھسیٹتے گھسیٹتے ہی چل رہی ہے اور چلتی رہیگی جب تک چلانے والا چلانا چاہے۔

کولکتہ میں جس جگہ میں اتنے برسوں سے رہتا آرہا ہوں میں اب اس جگہ کے محلِ وقوع سے نہ صرف مکمل طور پر واقف ہی ہو چکا ہوں بلکہ یہاں اس پوری بستی میں بود و باش کرنے والے لگ بھگ ہر ایک فرد کی بھی مکمل طور پر جانکاری رکھتا ہوں نہ انہیں ہی اور نہ مجھے ہی لگ رہا ہے کہ میں کوئی اجنبی یا غیر ہوں بلکہ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ میں بھی یہاں کا ایک مستقل باشندہ یا رہنے والا ہوں ان ہی کے کنبے کا ایک فرد ایک لازمی جز ہوں بھلے ہی ہمارا مذہب الگ الگ کیوں نہ ہوں کہ یہ ہندو ہیں اور میں مسلمان۔ رنگ ونسل قوم وملت، تہذیب وتمدن، عادات واطوار اور زبان وسوچ الگ الگ اور جداگانہ ہونے کے باوجود بھی وہ مجھے اور میں انہیں اپنا مانتا ہوں اور اچھی طرح سے جانتا ہوں بالکل ایسے ہی جیسے ہم ایک ہی ماں کی اولاد ہوں اور ایک ہی ماں کے جنمے ہوئے ہوں۔

بنگالی لوگ اچھے بلکہ بہت اچھے ہوتے ہیں۔ شاید یہ ایک بات بھی مجھے بچپن سے ہی بنگال کے ساتھ اس طرح باندھے ہوئے ہے۔ کہ میں اتنے برسوں سے بلا ناغہ یہاں آتا جاتا رہا ہوں ان کے پیار ومحبت اور اپنائیت کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔ ورنہ آج اپنے عزیز واقارب کو بھی نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔

جہاں میں رہتا ہوں یہ ایک خوبصورت بستی ہے۔ اس بستی میں

ایک جگہ سڑک پر ایک پنڈال سا بنا ہوا ہے جہاں شام پاس پڑوس کے سبھی بزرگ لوگ جمع ہو جاتے ہیں اور اپنے سکھ دکھ کی باتیں اپنے دیگر دوستوں کے ساتھ شئر کرتے ہیں اخبار پڑھتے ہیں اور ٹی وی وغیرہ دیکھتے ہیں۔

ان میں اکثر بزرگ اچھے اچھے گھرانوں کے پڑھے لکھے لوگ ہیں اور اکثر زمہ دار عہدوں پر رہ چکے ہیں۔ بڑے ملنسار، بردبار، اور تجربہ کار ہیں ان کا مہذبانہ تکلم اور ایک دوسرے کے ساتھ عزت واحترام کے ساتھ پیش آنا بہت اچھا لگتا ہے اس عمر میں بھی یہ ایک دوسرے کے لئے بہت فکرمند رہتے ہیں اور خیال بھی رکھتے ہیں۔ واقعی اسی کا نام انسانیت ہے جوان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔

گرمیوں کے دنوں میں پوجا فیسٹول پر ہم دس بیس دنوں کے لئے کولکتہ جاتے ہیں اس سال کشمیر میں سیاسی حالات انتہائی کشیدہ رہے لیکن ہم نے اس سے قبل ہی کولکتہ کا رخ کرلیا تھا۔

جان پہچان کے لوگ ہمیں دیکھ کر بہت حیران رہ گئے اور ابتر حالات کے بارے میں بڑے انہماک ومتانت کے ساتھ دریافت کرنے لگے۔

"آپ لوگ ڈیڑھ ماہ سے سخت کرفیو، بیلٹ گن اور مرچی گیس کی بوچھاڑ کیسے جھیل رہے ہو؟ وہ بھی سو سوا سو بچے، بزرگ، عورتیں اور گبرو نوجوان گنوا کر، ہزاروں شدید زخمی اور لاتعداد مستقبل کے معماروں کو نابینا بنا کر؟!" میں سوچ ہی رہا تھا کہ کیا جواب دوں۔ اتنے میں دوسری جانب سے اور ایک نرم اور دھیمی آواز میں کریدتا ہوا سوال میری سماعتوں سے ٹکرا گیا۔ "یہ عدنان کون تھا؟ میں ابھی تک اسی مخمصے اور شش و پنج میں تھا کہ کیا جواب دوں! کہ میرے سامنے سے میرا انتظار کئے بنا ہی دتو بابو گویا ہو گئے۔ "امتیاز بھائی کیا بتائینگے؟، میں بتاؤں گا کہ یہ عدنان کون تھا؟" سب لوگ بڑی توجہ کے ساتھ ان کی طرف دیکھنے لگے میں کچھ زیادہ ہی انہماک و تجسس میں تھا۔ دتو

بابو اٹھے اور سامنے الماری سے ایک مقامی اخبار اٹھا کر لائے اور اپنی جگہ پر دوبارہ بیٹھ گئے اور اسے یوں پڑھنے لگے۔

''عدناں بیس بائیس برس کا خوبصورت پڑھا لکھا اور شریف نوجوان تھا۔ایک دیندار اور کھاتے پیتے شریف خاندان کا فرد تھا جس کا باپ ایک اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھا جو محنت و مشقت اور حلال کی کمائی سے اپنے افرادِ خانہ کی پرورش کرتا تھا کہ ایک دن خاکی وردی والوں نے اس کے بڑے بیٹے کو شہید کر دیا پورے گھر کیا گاؤں والوں کے لئے یہ ایک بہت بڑا اور ناقابلِ برداشت سانحہ تھا اس طرح کے قتلِ ناحق پر عام لوگ ماتم کناں رہنے کے سوا اور کر بھی کیا سکتے تھے؟ خاص کر نوجوانوں کے قتل پر، اس واقعے اور اس طرح کے لاتعداد واقعات نے عدنان کے دل و دماغ پر بہت گہرا اثر چھوڑا ---------اور اس نے بندوق اٹھائی----!؟''

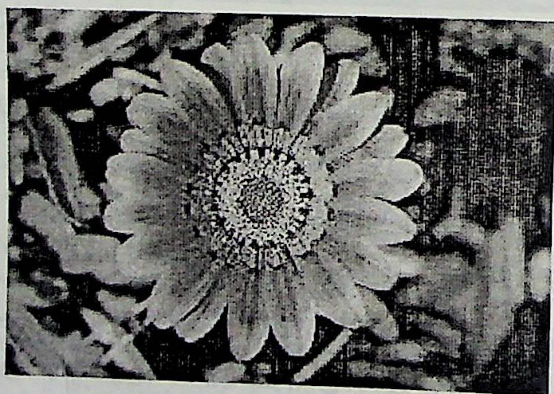
کسی کونے سے کسی اور بزرگ کی نحیف سی آواز آئی۔''ایسا نہیں کرتا تو اور کیا کرتا؟ اسے ایسا ہی کرنا تھا جو اس نے کیا؟ ان لوگوں نے ہی اسے ایسا کرنے کے لئے مجبور کر دیا''

پنڈال پر بیٹھا ہوا کوئی اور شخص بول پڑا ''قصور اس کا نہیں اسے مجبور کرنے والوں کا ہے''

ہم سب ہمہ تن گوش یہ ساری گفتگو سن رہے تھے۔ چاروں طرف خاموشی سی چھا گئی کہ کچھ دیر بعد دتو بابو بولنے لگے ''تعجب ہے کہ ایک زمہ دار حاکمِ وقت کا بیان بھی اسی اخبار میں سرخی کے تحت چھپا ہے پوچھتے ہیں کہ جارج واشنگٹن امریکہ کی آزادی سے پہلے اول نمبر کے دہشت گرد تھے پھر امریکہ کے پہلے صدر بن گئے۔نیلسن منڈیلا دنیا کے پہلے دہشت گرد تھے اور ایک لمبے عرصہ تک جیل میں بند بھی، پھر جب ساؤتھ افریکہ نسل پرست حکومت کے چنگل سے آزاد ہوا تو اس کے پہلے صدر اور نوبل انعام کے حقدار بھی۔''

دتّو بابو نے اور ایک سرخی پڑھ کر سنائی کسی حاکم نے پوچھا ہے کہ "کسی ملک کے دہشت گرد کو کسی دوسرے ملک میں شہید کیسے کہا جا سکتا ہے؟؟!!"

اب کے گوشؔ بابو سے رہا نہ گیا جو یہ سب گفتگو سنجیدگی کے ساتھ کسی ردِ عمل کے بغیر ہی سماعت کر رہے تھے۔ بڑی بے صبری کے ساتھ ایکدم بول پڑے۔ ویسے ہی جیسے برطانیہ کے پارلمنٹ پر بم پھینکنے والے کو کہا جاتا ہے۔"





نورا۔۔۔؟

''نورا۔۔۔۔۔۔۔،نورا۔۔۔۔۔۔،نورا۔۔۔؟ آؤ روٹی کھاؤ۔''

میرے مطب سے متصل گھر کی کھڑکی سے ایک ادھیڑ عمر کی عورت کی قدرے کرخت آواز نے مجھے چونکا دیا، حالانکہ اس طرح کی آوازیں میں اکثر سنتا ہی رہتا ہوں، گاہے نسوانی اور گاہے مردانی، لیکن شدت کی گرمی اور دھوپ کی وجہ سے مجھے اپنے چمبر میں خمار سا چڑھ گیا تھا اور میری منوم آنکھیں غلبۂ نیند سے بند سی ہونے لگی تھیں۔ اسی لئے اس زوردار آواز نے مجھے چونکا سا دیا۔

نورا۔۔۔، نور محمد ہے یہی کوئی پنتالیس پچاس سال کا، بظاہر صحت مند شخص، جسمانی طور پر یوں تو ٹھیک ٹھاک لگ رہا ہے لیکن دماغی طور پر۔۔۔۔۔۔تندرست نہیں ہے۔

کبھی گلی میں اکیلے کرکٹ کھیلتا ہوا نظر آتا ہے، کبھی سڑک کے کنارے بیٹھ کر خود کلامی کرتا ہوا، کبھی سگریٹ کے کش لگاتا ہوا تو کبھی اپنے چہرے کی عجیب وغریب شکلیں بناتا ہوا۔

اس کا بوڑھا باپ بھی اسے نورا کہہ کر ہی بلاتا ہے البتہ اس کی بھابی اسے طرح طرح کے نام دیتی ہے۔ پاگل، دیوانہ، اور نہ جانے کیا کیا کچھ۔۔؟
اور نورا کوئی مزاحمت کرتا ہے نہ کچھ کہتا ہے، چپ چاپ خاموشی کے ساتھ حکم کی تعمیل میں چلا جاتا ہے۔

نورا جس مکان مین رہتا ہے اس کی مخالف سمت میں فاروق احمد کی کریانہ کی دکان ہے۔ میں اس دکان پر کبھی کبھار فرصت کے لمحات میں سودا سلف خریدنے کے لئے جاتا ہوں۔ ایک دن باتوں باتوں میں فاروق احمد نے نورا اور اس کے گھر میں رہنے بسنے والے ہر فرد کا مکمل تعارف کرا دیا۔

نورا عام دماغی امراض میں مبتلا مریضوں کی طرح نہیں ہے ہاں البتہ ابتداء سے ہی سوچ سمجھ میں بہت کمزور و ناتواں ہے اس کا باپ سڑک پر دکان سجانے والوں میں سے تھا جو گھٹیا سے گھٹیا مال کو بڑھیا سا بڑھیا مال کے طور پر پیش کرنے میں ماہر ہوتے ہیں اور اس نے اپنی اسی وصف کو بڑی ہنرمندی سے، کام میں لاتے ہوئے، ایک اچھی خاصی لڑکی سے نورا کی شادی کر دی۔

وہ لڑکی اور اس کے گھر والے جب تک نورا کی اصل حالت سے واقف ہو گئے تب تک بہت دیر ہو چکی تھی اور دو بچے بھی ہو گئے تھے ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔

پھر وہی ہوا جو ہونا تھا۔ طلاق ہو گئی اور دونوں بچے ماں کے ساتھ اس کے میکے آ گئے اور وہاں پر پرورش پانے لگے۔

بچوں کی ماں نے دوسری شادی نہیں کی۔ اور اپنی جوانی کو اپنے بچوں کی نذر کر دیا۔ اور ان کی اچھی تعلیم و تربیت اور پرورش پر خاص توجہ دی۔

وقت جوں توں کر کے گذر گیا اور دونوں بچے اچھی تعلیم و تربیت سے پڑھ لکھ کر جوان ہو گئے اور ایک اچھے اور تابناک مستقبل کی طرف شد و مد سے گامزن رہنے لگے جوان کی

ذہانت وقابلیت کی بناء پر ان سے زیادہ دور نہیں تھا۔خاص کر ان کی ماں کی بدولت ورنہ ان کا باپ نورا۔۔۔۔۔۔؟!

ہر روز مطب پر آ کر نورا سے آس پاس ہی میری مڈ بھیڑ ہو جاتی ہے نہ جانے مجھے ان دونوں بلکہ ان چاروں کا خیال کیوں کر آتا ہی رہتا ہے اور اکثر کرید تا بھی رہتا ہے اور میں کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہوں اور عجیب طرح کے سوالات میرے ذہن و دل کو گھیر لیتے ہیں۔

"کیا نورا کو یہ احساس ہوگا کہ اس کی ایک بیوی اور دو بچے بھی ہیں۔جن سے اس کو بچھڑنا پڑا تھا؟ یا پھر اس کی بیوی کو زندگی بھر اپنی ناکام و نامراد ازدواجی زندگی کی فکر اندر ہی اندر کرید تی ہوگی؟ یا پھر زندگی کے لمبے اور صبر آزما سفر میں ہر قدم پر اسے ایک ایسی خلش اور کمی کا بھرپور احساس رہتا ہوگا جسے وہ پورا ہوتا ہوا نہ دیکھ کر مذید پریشان ہو رہی ہوگی وغیرہ؟ان کے ان دونوں بچوں کو اپنے باپ کے متعلق کس طرح کے جذبات واحساسات ہونگے وغیرہ؟

ہر جمعہ کو میرا مطب بند رہتا ہے اور چھٹی رہتی ہے ایک جمعہ کو صبح صبح میں اچانک زیبا کے گھر پہنچ گیا۔جو میرے پاس اکثر اپنے اور اپنے بچوں کا علاج کرانے آتی تھی۔زیبا کے والدین بھی آیا کرتے تھے ان کے انتقال کے بعد زیبا اپنے گھر میں اکیلی رہا کرتی تھی۔

لڑکا دانش ریاست سے باہر کسی کالج میں زیرِ تعلیم تھا اور لڑکی بڑی تھی اس نے کالج میں ہی کسی ہمجماعت کے ساتھ شادی کر لی تھی۔میاں بیوی دونوں گلف میں رہ رہے ہیں۔

زیبا اپنی ضروریات زندگی والدین کی بنائی ہوئی دوکانوں وغیرہ کے کرائے سے پوری کرتی تھی۔چونکہ والدین کی اکلوتی اولاد ہے اسلئے اکلوتی وارث

ہونے کی وجہ سے گذر بسر کر رہی ہے گھر میں تنہا رہ رہی ہے۔ رشتے کے ایک ماموں کبھی کبھار آیا کرتے تھے لیکن کچھ عرصہ قبل ان کا انتقال بھی ہو گیا۔

چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے جب میں نے زیباؔ سے اس کی نجی زندگی کے متعلق سوالات پوچھنے شروع کئے تو وہ چونک سی گئی اور میرے سوالوں کا جواب بڑے محتاط انداز میں دینے لگی۔ پھر جب میں اسے یہ تسلی دینے میں کامیاب ہو گیا کہ معلومات حاصل کرنے کے پیچھے میرا کوئی ذاتی مقصد ہرگز نہیں ہے تو وہ نظریں جھکا کر قدرے سکون واطمنان کے ساتھ بات کرنے لگی۔

ابتداء میں کچھ ہچکچاہٹ سی محسوس کرنے کے بعد وہ بالآخر ایسے کھل گئی جیسے گذری ہوئی ایک ایک ساعت کا حساب پیش کر رہی ہو۔ اس نے نم دیدہ آنکھوں سے جی کھول کر باتیں کیں جیسے وہ ایک مدت سے توجہ اور انہماک کے ساتھ اس کی روداد سننے والے کسی شخص کی تلاش میں ہی تھی یا پھر چھاتی پر پڑے اپنے بھاری چٹان جیسے بوجھ کو ہلکا کرنا چاہتی تھی۔ وہ بھی ایک مدت کے بعد۔

اس کی اس رام کہانی کا لب لباب مختصر الفاظ میں یہ نکلا کہ وہ اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعے کا زمہ دار مکمل طور پر اپنے باتونی، بازاری اور چالاک سسر کو گردانتی ہے جس نے جان بوجھ کر اپنے کھوٹے سکے یا گھٹیا مال کو عمدہ اور بڑھیا جتلا کر، بڑی ہوشیاری اور لفاظی سے سیدھے سادھے گاہک کو پھنسالیا۔

زیباؔ کو اپنے شوہر نورؔ محمد سے کوئی گلہ نہ تھا اس کی نظر میں وہ عقل وخرد سے بیگانہ ہونے کی وجہ سے بے قصور ہے اور صحیح اور غلط کا فیصلہ کرنا اس کے بس کی بات نہیں ہے اور نہ وہ خود کوئی فیصلہ لینے کی استطاعت یا قابلیت رکھتا ہے۔

زیبا میرے اس غیر متوقع اور اچانک سوال سے دوبارہ چونک پڑی کہ کیا وہ عمر کے اس پڑاؤ پر اپنی تنہائیوں کے خلیج کو پاٹنے کے لئے اور اپنے جان لیوا

اکلوتے پن کو کم کرنے کے لئے اپنے دو بچوں کی باپ نور محمد عرف نورا کے ساتھ رہنے بسنے کو ترجیع دے سکتی ہے؟!!۔

میرے اس حیران کن اور غیر متوقع سوال پر وہ جھنجھلاہٹ اور حیرانی کے عالم میں اپنا چہرہ اوپر اٹھا کر میری طرف ایسے دیکھنے لگی جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہو؟۔ یا پھر جیسے اسے میری عقل وخرد پر بھی شک یا شبہ ہو گیا ہو۔

کچھ دیر بعد یہ طلسم ٹوٹنے کے بعد صورت حال برقرار ہوجاتے ہی وہ اپنے تمام تر حواس کو مجتمع کرتے ہوئے کچھ بڑ بڑانے لگی اس بات کے باوجود بھی یہ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ اس کی زبان اس کا ساتھ نہیں دے پا رہی ہے۔

جوں توں کر کے متفکرانہ مگر ناہموار لہجے میں، ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں وہ کچھ کہنے کے قابل ہو گئی۔

"مگر------ میرے ----- بچے-----؟؟ اور پھر گلی محلے------- کے یہ لوک اور------ جان پہچان والے ------- انہیں کیا------ جواب دوں؟؟!!۔

"زیبا---!! تمہارے---وہ بچے ---- اور گلی محلے کے لوگ اور جان پہچان والے-----اتنی دیر سے کہاں ہیں جنہوں نے تمہیں یہاں اس گھر نہیں، اس مکان میں تنہا قید کر دیا ہے؟ ان میں سے کوئی تمہیں پوچھنے آتا ہے کہ تمہاری زندگی کیسے کٹ رہی ہے؟ تم کیا کھاتی ہو کیسے رہتی ہو؟ بات کس کی سنتی ہو اور اپنی کس کو سناتی ہو؟ تمہارے والدین کے انتقال کے بعد، تم اس گھر میں اکیلی بیٹھی ہو بالکل اکیلی اگر تمہاری اس تنہائی تمہارے اس مجرد پن کو پاٹنے والا، کوئی غیر نہیں تمہارا شوہر، تمہاری کل متاع، تمہاری بیٹی اور تمہارے بیٹے کا حقیقی والد، تمہارے ساتھ رہنے لگے تو کسی کو کیوں کر کوئی اعتراض ہوسکتا ہے اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ اس کی حالت بھی اس لحاظ

سے تسلی بخش نہیں ہے اس کے والدین بھی انتقال کر گئے ہیں اور وہ بھی اب دوسروں کے رحم وکرم پر ہے۔

تمہارے بچوں کو بھلا کیا اعتراض ہوسکتا ہے؟ آخر وہ بھی تو اسی کی اولاد ہے وہ عقل وخرد سے بیگانہ ہی سہی ان کا باپ ہی تو ہے اور پھر اتنا بھی بیگانہ نہیں کہ دوسروں کے لئے وبال جان بن جائے بالکل ویسا ہی ہے جیسا آج سے بیس تیس سال پہلے تھا۔

تمہارے بچوں پر اگر ماں کی خدمت اور فرمانبرداری کا حق ہے تو کیا باپ کی خدمت و فرمانبرداری کا حق نہیں ہے۔۔۔؟ جب کہ وہ اس کا پنی ظاہری یا جسمانی حالت کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی مستحق ہے۔۔۔؟؟!!

میرے خیال میں وہ زیادہ خدمت وخیال کا اسلئے بھی مستحق ہے کہ وہ تم سے زیادہ مجبوری اور بے بسی کی حالت میں زندگی گزار رہا ہے تم کسی سے کہہ سکتی ہو اور وہ کسی سے کہہ بھی نہیں سکتا ہے نہ احتجاج ہی کرسکتا ہے بس خاموش رہ کر سب کچھ برداشت کر سکتا ہے اور کر بھی رہا ہے۔

وہ زندگی کے جس مرحلے کی طرف بڑھ رہا ہے وہاں حالات بہتر ہونے کے بجائے مزید ابتر ہوسکتے ہیں اگر ایسا ہوا تو یہ اس بدنصیب کے لئے اور بھی برا ہوگا کہ اس کی خبر گیری کرنے والا کوئی نہیں ہے۔

زیبا خاموشی اور نم دیدہ آنکھوں کے ساتھ یہ سب توجہ سے سنتی رہی ایسا محسوس ہورہا تھا کہ وہ جواب دینا چاہتی ہے لیکن نہ دے پارہی ہے۔ کچھ وقفہ یونہی گذر گیا اور ۔۔۔۔۔۔اس کے اندر پیدا ہونے والے لاتعداد اندیشے، زبان کھولنے سے اسے روک رہے تھے۔ اسے اسطرح بے بس ولاچار دیکھ کر میں پھر اس کی طرف مخاطب ہوگیا۔

"میں تمہارے دونوں بچوں کو بچپن سے جانتا ہوں بڑے سمجھدار اور فرمانبردار

بچے ہیں ۔میرے خیال میں انہیں تمہارے ذاتی فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے اور پھر انہیں سمجھایا بھی جا سکتا ہے؟۔

زیبا اس وقت تک بھی خاموش ہی تھی اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ ابھی تک اندرونی کشمکش وانتشار میں الجھی ہوئی ہے اور کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی ہے۔

زیبا تم ایک سلجھی ہوئی اور حوصلہ مند خاتون ہو پورا خاندان اور محلہ بھر کے لوگ تمہارے حوصلے فہم وفراست، صبر واستقلال اور تدبر کی قدر کرتے ہیں۔تم نے انتہائی جرات مندی سے لگ بھگ تین دہائیوں پر محیط ایک لمبے عرصہ تک اپنے آپ ،اپنے بچوں اور والدین کو سنبھالے رکھا خدا تمہیں ضرور اس کا نیک اجر دے گا۔کوئی جلد بازی یا عجلت نہیں ہے نہ مجھے اس میں کوئی ذاتی مقصد یا غرض ہے تمہارے والدین کے ساتھ میرے دوستانہ مراسم رہے ہیں میرے ہی کیوں سب جاننے پہچاننے والوں کے ہمدرد وخیر خواہ تھے اور ہر ایک کے کام آتے تھے اللہ انہیں مغفرت نصیب فرمائے تم بھی تو میرے اپنے ہی بچوں جیسی ہو۔تم سوچ سمجھ کر وہ فیصلہ کر سکتی ہو جو تمہیں اچھا لگے تمہارا فیصلہ ہی سب سے بہتر اور افضل ہوگا آخر زندگی بھی تمہیں ہی گذارنی ہے۔جس طرح چاہو گذار سکتی ہو دوسرا اس میں مخل ہونے کا کیا حق رکھتا ہے؟ مجھے تمہاری دانشمندی پر پورا بھروسہ ہے۔

زیبا اپنی ساری ہمت اور حوصلہ مجتمع کر کے آنسو پونچھتے ہوئے اٹھی اور خالی پلیٹیں اور کپ وغیرہ ٹرے پر سمیٹتے ہوئے کچن کی طرف جانے سے قبل نظریں جھکا کر مجھ سے یوں مخاطب ہونے لگی۔ ”حکیم صاحب ۔۔۔۔آپ اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہنا سکتے ہو۔۔۔۔۔۔میری طرف سے کوئی اعتراض نہیں ہے؟۔

یہی کوئی دو ڈھائی سال ہو گئے ہونگے زیبا اور نورا اپنے گھر میں ایک ساتھ رہ

رہے ہیں ان کے دونوں بچوں نے جوں توں کر کے اپنے سگے باپ کو قبول کرلیا اور ان کا اکلوتا بیٹا ایک حکومتی ادارے میں انجینئر ہے اور جلد ہی شادی کے رشتے میں بندھنے والا ہے۔

میں اپنے مطب میں اسی طرح ہفتے میں دو دن کا ناغہ کر کے بیٹھتا ہوں۔

میرے مطب والے پڑوسی کی کھڑکی سے اب نورآ۔۔۔۔۔نورآ۔۔۔۔۔نورآ۔۔۔۔۔کی دلخراش اور پریشان کن آوازیں نہیں آتیں۔۔؟!





سبز پری

بیٹیاں کتنی جلد بڑی ہوجاتی ہیں۔بشرٰی ہماری تیسری بیٹی ہے۔ڈاکٹری کر رہی ہے۔ایم ڈی کا پروگرام ہے۔

مجھے ایسا محسوس ہورہا ہے جیسے کل ہی کی بات ہو۔روز شام کو، خاص طور پر خون جمادینے والے جھاڑے کی سرد راتوں کو سوتے وقت کوئی نہ کوئی نئی کہانی سننے کا تقاضہ کرتی تھی سنی سنائی اور پرانی نہیں مجبوراً ہر روز کوئی نہ کوئی نئی کہانی گڑھنی پڑتی تھی۔

بار بار سبز پری کی کہانیاں سن سن کر سبز پری اس کی سہیلی بن گئی تھی۔اور ہر عید پر بشرٰی کے تکیہ پر ایک عدد ملکی چاکلیٹ رکھنا ہرگز نہ بھولتی تھی اور اکثر بشرٰی کے سو جانے کے بعد اس سے ملنے کے لئے آجاتی تھی۔

ہر عیدہ کی صبح کو بشرٰی جاگ کر سب سے پہلے اپنے تکیہ کو فوراً ہٹاتی تھی اور وہاں ایک عدد چاکلیٹ پا کر انتہائی خوش ہوجاتی تھی کہ اس کی سہیلی اسے بھولی نہیں ہے۔عرفہ کی شام سے ہی بشرٰی کو فکر رہتی تھی۔

ایک عرصہ تک یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا۔ اور پھر موٹی موٹی کتابوں کے بھاری بھر کم وزن نے بشرٰی سے اس کی سہیلی چھین لی ہزار پریشانیوں نے ہماری ہی بشرٰی کو نہیں ساری بشراؤں کے معصوم اور خوبصورت خواب چھین لئے اور ان کے بچپن کو لاتعداد فکروں اور اندیشوں کی نذر کر دیا۔

مجھے وہ دن بھی اچھی طرح سے یاد ہے جب۔۔۔ حد سے زیادہ محنت و مشقت کے باوجود بھی انٹرنس میں وہ کالیفائی نہ کر سکی۔ اس دن وہ بہت روئی تھی ذرا سے ایک آدھ نمبر کی کمی سے رہ گئی تھی۔ ہم سے اس کا اس طرح کا رونا برداشت نہیں ہو پایا تھا ہم دونوں میاں بیوی اسے تسلی دیتے رہے اور ایک دن اسے ریاست سے باہر لے جا کر ایک میڈیکل کالج میں داخلہ کرآئے۔

اب وہ گھر اور افرادِ خانہ سے دور بہت دور ایک اجنبی جگہ پر تھی اور اسے سب کچھ خود ہی مینیج کرنا پڑ رہا تھا اور اس نے یہ سب کچھ کر کے دکھایا اور بہت اچھی طرح سے کر کے دکھایا۔

دو تین سال گذر جانے کے بعد جب ہم دونوں میاں بیوی اس کے

کالج گئے تو اس ایک میں

HOD نے ہمیں خاص طور پر اپنے آفس میں بلایا اور چائے ناشتے کا بندوبست بھی کروایا۔ مسز خان بشرٰی کی خاموش طبیعت، صبر و استقلال اور بردباری کی بہت معترف تھی اسی لئے مسز خان کو بشرٰی کے والدین کو دیکھنے اور ان کے ساتھ بات کرنے کا بہت اشتیاق و تجسس تھا ہم یونہی ایک آدھ گھنٹہ ان کی قربت میں رہے اور ان سے باتیں کرتے رہے۔ مسز خان بتا رہی تھیں کہ انہیں ہم سے ملنے کا اشتیاق اسلئے تھا کہ وہ دیکھنا چاہتی تھیں کہ بشرٰی جیسی قابلِ ترین اسٹوڈنٹ کو فرقہ واریت کی بناء پر آگے آنے سے روکنے والے کبھی پریکٹکلز میں کم نمبر دے کر

اور کبھی وائیوا میں، اور کبھی کسی اور سبجکٹ میں، لیکن اس سب کے باوجود بھی کلاس اسپیرنس، ڈبیٹس اور ڈسپلن وغیرہ میں بشریٰ ہمیشہ آگے آگے ہوا کرتی ہے۔

بشریٰ کی پڑھائی جاری رہی اور آج وہ اچھے نمبرات سے پاس ہوگئی بالآخر اس کی محنت ومشقت رنگ لائی اور اسے اس کے صبر واستقلال کا ثمرہ بھی مل گیا جس کی وہ مستحق بھی تھی۔

کلنک سے آتے ہی مجھے بیگم نے یہ خوش خبری سنائی اسے ابھی ابھی بشریٰ کا فون آیا تھا۔ میں نے بھی اس سے بات کرلی اور اسے مبارک باد دے دی۔ اتفاقاً آج ۱۲ر مارچ کی تاریخ بھی ہے اور یہ دن بشریٰ کا جنم دن بھی ہوتا ہے۔

شام میں لیپ ٹاپ پر مصروف تھا اپنا کام مکمل کر کے مجھے بشریٰ کا خیال آیا اور اس کے جنم دن کا بھی۔ میں نے فوراً مسیج لکھنا شروع کر دیا۔ تاکہ بشریٰ کو اس کی دوہری خوشی پر مبارک باد دے دوں۔ بہت بار لکھنے اور مٹانے کی مشق سے گزرنے کے بعد میں بالآخر اس عبارت پر رک گیا۔

''تمہاری پیدائش پر تمہاری ممی اپنے ہاں تیسری بیٹی کی پیدائش پر بہت روئی تھی اور تمہارے ڈیڈی نے تیسری سبز پری کی آمد پر دو رکعت نمازِ شکرانہ ادا کی تھی۔ پھر بھی جنت ماں کے قدموں میں ہے۔

ڈاکٹر بشریٰ کو اس کے جنم دن اور امتحان میں پہلی پوزیشن کے ساتھ پاس ہونے پر بہت بہت مبارکباد۔۔۔۔!''

دوسرے دن جب میں اپنا میل چیک کر رہا تھا تو بشریٰ کے ریپلائی پر میری نظریں رکی کی رکی ہی رہ گئیں۔

''ڈیڈی۔۔۔۔ ۱۲ر مارچ ۱۹۹۷ء کو میری ولادت پر آپ کی دو رکعت نمازِ شکرانہ نے مجھے ہمت وحوصلہ اور اعتماد وتوکل عطا کیا اور ممی کی

عاجزی وانکساری نے مجھے صبر واستقلال اور فہم وفراست سے نوازا۔
اسی سب کی بدولت آج میں، ۔۔۔۔۔۔میں ہوں آپ کی بیٹی ۔۔
آپ کی بشریٰ ۔۔۔۔۔آپ کی سبز پری۔۔؟!





خود کش بمبار

یہ لوگ کتنے بہادر، نڈر اور باہمت ہوتے ہیں کہ آناً فاناً اپنے آپ کے ساتھ بارود باندھ کر اسے اپنے ہاتھوں سے ہی اڑا دیتے ہیں اور پلک جھپکتے ہی ان کے جسم کا انگ انگ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ کر فضا میں بکھر جاتا ہے اور پاس پڑوس کے چیل کوؤں کی خوراک بن جاتا ہے ان کے جسم کی رگوں میں دوڑنے والا گرم گرم لہو چھینٹوں میں منتشر ہو کر گرد و غبار میں گم ہو جاتا ہے اور وہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت سے ایک خواب، ایک خیال بن جاتے ہیں ایسے جیسے کبھی تھے ہی نہیں، جیسے ان کے قدم اس زمین پر پڑے ہی نہ تھے۔

انہیں خود کش بمبار بھی کہتے ہیں کسی بھیڑ بھاڑ

والی جگہ پر، زیادہ سے زیادہ انسانوں کو بے دردی کے ساتھ قتل کرنا ہی ان کا ٹارگٹ ہوتا ہے۔ بچوں ، بوڑھوں، عورتوں، مردوں کی انہیں کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوتی انسان ہونے چاہئے خواہ وہ اسکول کے معصوم بچے ہوں ، بازار سے گذرنے والے مسافر، مسجد میں نماز پڑھنے والے نمازی یا کسی شفاخانے کے مریض یا پھر خاکی وردی میں ملبوس فوجی یا پولیس اہلکار وغیرہ۔

اب اس طرح کے واقعات ہر جگہ ہونے لگے ہیں۔ افغانستان۔ عراق، لیبیا، شری لنکا یا کشمیر و پاکستان وغیرہ۔ روز اسطرح کی خبریں سننے اور پڑھنے کو ملتی ہیں اور انسانی اعضاء کو بکھیر دیا جاتا ہے۔ اپنے آپ پر بم اور بارود باندھنے والے تو اس واقعے کے بعد دکھائی ہی نہیں دیتے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ اسطرح کی حماقت کو کیا کہا جائے۔ کچی عقل، کمزور فہم و فراست، جہالت و دیوانگی یا پھر جنون و پاگل پن یا پھر کچھ اور،

ایسے بہت کم لوگ اس طرح کی حرکت انجام دینے سے قبل ہی پکڑے جاتے ہیں۔ جن میں ایک عمران بھی ہے جو ڈسٹرکٹ جیل کی کال کوٹھری میں کئی ہفتوں سے پڑا ہوا ہے۔

اتوار کی چھٹی تھی اور میں صبح صبح گھر سے ڈسٹرکٹ جیل میں بہت مشکل سے اجازت لے کر اس سے ملنے آیا ہوں۔ عمران کو کچھ عرصہ قبل شہر کے مصروف ترین بازار میں بارود باندھ کر زندہ ہی گرفتار کیا گیا تھا۔ اور وہ ابھی تک زیر تفتیش ہے۔

پندرہ سولہ برس کا ایک خوبرو گبرو نوجوان، گندمی رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، سنہری مونچھیں جو ابھی نکلنی ہی شروع ہو رہی ہیں، لمبا قد اور دبلا پتلا شریر، اسی سب کو تہس نہس کرنے اور ٹکڑوں میں منتشر کرنے والے لڑکے کا نام عمران ہے جو آج ڈسٹرکٹ جیل کی اس کال کوٹھری میں پڑا ہوا ہے اور زندہ بھی ہے اور اگر اس نے وہ عمل

کر دیا ہوتا تو اس کی جگہ پر آج دنیا میں بے نام و بے وجود خلاء کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا۔

پی ایچ ڈی کے لئے میرے مقالے کا موضوع خود کش بمبار ہی ہے اور میں پچھلے ایک برس سے اس پر کام کرر ہا ہوں۔ میں اس ضمن میں کئی جگہوں پر گیا اور کئی جیلوں کا میں نے دورہ بھی کیا۔ آج اس جیل کا رخ کرلیا ہے تا کہ عمران سے مل لوں۔ کئی لوگوں سے مل کر ان کے تاثرات ریکارڈ کئے اور مفصل سمری تیار کی تا کہ اس نئے اور اچھوتے موضوع پر بھر پور روشنی ڈال سکوں اور آئندہ اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لئے راہ ہموار ہو سکے۔ میں نے ایک سوال نامہ مرتب کرر کھا ہے اس میں ترتیب وار سوالات لکھے ہیں جن کے جوابات دوران انٹرویو میں خود ہی لکھ لیتا ہوں اس سے بڑی آسانی ہو جاتی ہے۔

عمران سے ابتدائی اور سرسری بات کرنے کے بعد مجھے لگ رہا ہے کہ اس کی کہانی کچھ الگ نوعیت کی ہے۔ عمران کی گرفتاری کے بعد لاتعداد لوگ اس سے ملنے آئے ہیں جن میں زیادہ تر تفتیشی اور سراغ رساں ایجنسیوں اور اداروں کے زمہ دار شامل تھے۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ انہوں نے ان سے کیا کچھ پوچھا؟ اور کیا کیا طور طریقے اور میتھوڈ استعمال کئے؟ یہ سب ابھی تک صیغۂ راز میں ہی ہے۔ عام طور پر اس طرح کی تفتیشی ایجنسیاں ،راز اگلوانے یا پھر اپنی بات قبولوانے کے لئے ،زبردست ٹارچر، مار پیٹ، گالی گلوچ سے بہت آگے بڑھ جاتے ہیں اور نا قابلِ بیاں اذیتیں دے کر اصل بات یا پھر حسب توقع بات اگلواتے یا پھر قبولواتے ہیں۔

کال کوٹھری میں عمران ایک اجنبی شخص کو دیکھ کر، متحیر آنکھوں سے پہلے مجھے گھورنے لگا مجھے فوراً یہ احساس ہوا کہ مجھے پہلے اپنا تعارف کرانا ہوگا اور پہلے اس سے گھل مل جانا چاہیے۔

میں نے اسے اپنا قدرے بھر پور تعارف پیش کیا اور اسے اپنے

اغراض ومقاصد سے روشناس بھی کرایا۔اس سے میں اس خود کش بمبار کا ذرا سا اعتماد جیتنے میں کامیاب بھی ہوگیا۔ یہ بات بھی ہے کہ میں نے، اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے کچھ ایسے الفاظ بھی استعمال کئے جو اس کے موافق بھی ہو سکتے تھے۔

اس دوران عمرآن کے کان اور آنکھیں میری طرح متوجہ تھیں۔وہ میرے بارے میں کیا سوچ رہا تھا؟ اس کی خاموشی اس کے باطن پر مکمل طور پر پردہ ڈالے ہوئے تھی۔

اس سے قبل میں متعلقہ جیلر سے عمرآن کے متعلق مکمل دستیاب جانکاری حاصل کر چکا تھا۔جس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ پڑھا لکھا بھی ہے۔

مسلسل باتیں کرکے میں اب خاموش ہوگیا تھا اور عمرآن بھی اب تک خاموش ہی تھا اس کی چپ توڑنے کے لئے میں نے اس سے کچھ ایسے سوالات پوچھنے شروع کر دئے جن کا کچھ نہ کچھ جواب اسے دینا ہی پڑتا لیکن وہ پھر بھی ہاں ہوں میں ہی مجھے ٹرخاتا رہا۔وہ نہ جانے اب تک کتنے سخت اور انتہائی پریشان کن تفتیشوں سے گذرا ہوگا؟ اور پھر میرے استفسار کا جواب دینا یا نہ دینا اس کی اپنی مرضی پر منحصر ہے ضروری نہیں کہ جواب نہ ملنے پر اسے تشدد کا شکار ہونا پڑے یا پھر کسی جبر وزیادتی کا ہی اور پھر مجھے اس بات کا تجربہ بھی تھا کہ اس ضمن میں اور ایسے کیسوں میں پہلی ہی ملاقات میں کسی کا بھروسہ جیتنا ممکن بھی نہیں تھا۔

کئی بار، بار بار کھنگالنے کے باوجود بھی جب وہ کچھ نہ بولا اور پھر ملاقات کا وقت بھی ختم ہونے والا تھا تو میں نے اپنا سوالنامہ اس کے ہاتھوں میں سونپتے ہوئے اس سے گذارش کی کہ وہ فرصت کے اوقات میں اس پر ذرا غور کریں اور اسے مکمل کر کے یا تو جیلر صاحب کو سونپ دے یا پھر ہفتہ بعد میرے دوبارہ حاضر ہونے پر مجھے ہی دے دیں۔

دس دن بعد جب میں جیلر صاحب سے دوبارہ ملنے کے لئے آیا تو میری حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی جب مجھے یہ بتایا گیا کہ دو دن قبل خودکش بمبار عمران، اپنی کال کوٹھری میں مردہ پایا گیا۔

جیل کے ڈاکٹر نے پوسٹ مارٹم رپورٹ میں یہ بتایا تھا کہ اس کی موت پھانسی لگنے سے ہوئی ہے۔ پاجامہ کا ناڑا گلے میں ڈال کر خودکشی کرنے سے۔ اس کے غریب والد کو بلا کر لاش وغیرہ سونپ دی گئی تھی اور باقی قانونی لکھا پڑھی بھی مکمل کرائی گئی تھی۔

دو ماہ گذر گئے ہونگے ایک دن ایک ادھیڑ عمر کے بزرگ شخص ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے صبح صبح میرے گھر میں وارد ہو گئے علیک سلیک کے بعد میری طرف ایک لفافہ بڑھانے لگے۔ جسے کھول کر مجھے وہ فارم مل گیا جو میں نے عمران کو اپنی پہلی ملاقات کے وقت سونپ دیا تھا۔

میں اس اجنبی شخص کی طرف دوبارہ متوجہ ہو کر بڑے انہماک سے پوچھنے لگا خاص طور پر اس لفافے کے بارے میں جو اس نے مجھے سونپا تھا۔

اس نے یوں خلاصہ کیا۔ دراصل وہ بھی عمران کی کال کوٹھری کے متصل ہی کسی سنگگین جرم کی پاداشت میں عمر قید کی سزا کاٹ رہا تھا اور عمران کی خودکشی سے دو تین روز قبل ہی سزا مکمل کر کے چھوٹ گیا تھا۔

یہ ادھیڑ عمر کا شخص مجھے بتا رہا تھا کہ اکثر جیل میں ایسا نہیں ہوتا لیکن پرانے اور بوسیدہ واش رومز کی مرمت کے سلسلے میں انہیں جیل میں ایک مشترکہ واش روم استعمال کرنا پڑتا تھا اسی دوران عمران اور اس کی مڈبھیڑ کئی بار اس کے ساتھ ہوتی رہی اور ایک دن اس نے یہ لفافہ انہیں یہ کہتے ہوئے سونپا کہ وہ یہ لفافہ جیل سے چھوٹتے ہی آپ کو تلاش کر کے سونپ دیں چونکہ اس سوال نامے پر میرا موبائیل نمبر لکھا ہوا تھا اسلئے اس بزرگ کو

مجھے تلاش کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔

ادھیڑ عمر کا یہ شخص بات چیت سے زیادہ پڑھا لکھا نہیں لگ رہا تھا نہ اس پر کسی قسم کا کوئی شک کرنے کا جواز ہی بنتا تھا پھر بھی میں نے اس سے احتیاطاً اس کا مکمل ایڈرس لے لیا تا کہ ضرورت پڑنے پر جانچ کی جا سکے۔ اتفاقاً وہ ہمارے قریب کا ہی رہنے والا تھا۔

دوسرے دن میں مذکورہ شخص کے علاقے میں گیا اور وہاں اس کی پڑوس میں رہنے والے اپنے ایک قریبی دوست سے اس کے فراہم کردہ معلومات کے بارے میں دریافت کرنے لگا اور انہیں حرف بہ حرف درست پایا۔

اس کے بعد میں پھر ایک بار عمران والے سوال نامے کو دوبارہ کھول کر پڑھنے لگا جسے میں اب تک لاتعداد بار پڑھ چکا تھا کہ اس کے الفاظ تک مجھے اب ازبر ہو گئے تھے۔

اس میں دیئے گئے سوالات کے جوابات حسبِ توقع ہی تھے ان میں کوئی نئی بات نہ تھی۔ نہ ان سے مجھے کوئی پریشانی، تشویش یا کوئی فکر ہی لاحق ہوگئی البتہ فارم کے آخر میں، بچی ہوئی خالی جگہ پر میں نے ہاتھ سے REMARKS کالم بنایا تھا اور سرخ سیاہی والا قلم استعمال کر کے یہ لکھا تھا جو باقی فارم کی طرح پرنٹڈ نہ تھا۔

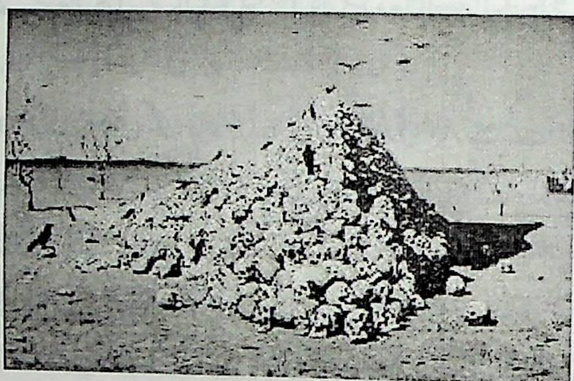
"عمران تم سولہ سترہ سال کے ایک خوبصورت اور اسمارٹ، شائستہ، سمجھدار اور پڑھے لکھے نوجوان ہو، لیکن افسوس صد افسوس پھر بھی تم اسطرح کے گھناؤنا کام انجام دیتے ہوئے پکڑے گئے ہو؟ جس کا انجام صرف اور صرف موت ہے موت کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے؟ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر تمہاری اور تمہارے ہی دوسرے اشخاص کے ناپختہ اذہان اور کچی عقلوں میں موت کا کیا تصور

ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟؟!!۔"

عمران نے سرخ سیاہی سے پوچھے گئے میرے اس سوال کا جواب بھی سرخ سیاہی سے ہی دیا تھا۔ شاید اپنے خون کی سرخ سیاہی سے۔۔۔ ورنہ جیل کی کال کوٹھری میں سرخ سیاہی۔۔۔۔۔۔ کہاں سے، آجاتی۔۔۔۔۔؟؟!!۔

"میرے ہاں بھی موت کا تصور اتنا ہی بھیانک ہے جتنا یہ کسی اور کے ہاں ہوسکتا ہے۔ میں اس کال کوٹھری میں، دوسرے نہ جانے کتنے لوگوں کی موت کو ٹالنے پر ہی بیٹھا ہوا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ مرنا میرا مقدر بن چکا تھا اور ہے بھی، اور یہ بھی جانتا ہوں کہ بہت جلد میں حادثاتی طور پر یا پھر کسی دوسرے طریقے سے مارا جانے والا ہوں اور میں اس کے لئے تیار بھی ہوں۔ میں نے سوچا، کہ اگر دونوں صورتوں میں مجھے بھی مرنا ہے؟ تو میں کیوں نہ اپنی، ہاں صرف اپنی ہی موت کو، دوسرے نہ جانے کتنے لوگوں کی موت پر ترجیح دوں۔

والسلام"



کتنے آدمی ہیں۔۔۔؟، سرکار ۔۔۔۔تین؟!۔

میجر تھاپہ نے فلمی انداز میں اپنے دوسرے ساتھیوں سے پوچھا جو پچھلے چوبیس گھنٹوں سے گولیوں کی دھندناہٹ میں اپنے محفوظ بنگروں میں مشین گنوں سے اندھا دھند گولیوں کی بوچھاڑ کر رہے تھے۔

"کتنے۔۔۔۔۔۔۔۔آدمی۔۔۔۔۔۔۔۔ہیں؟؟!!۔" "سرکار۔۔۔۔۔۔۔۔، تین آدمی۔۔۔۔۔؟!۔"

کسی نے بنگر سے اسی انداز میں جواب دیا اور اس کے ساتھ ہی مشین گنیں ایک ساتھ پھر سے گرجنے لگ گئیں۔

جی ہاں یہ تین گبرو نوجوان ہی تھے۔ مسلح تھے کل شام اس سرکاری عمارت میں گھس گئے۔ اس سے قبل ساتھ والی قومی شاہراہ پر گذرنے والی فوجی گاڑی پر فائرنگ کر کے کئی جوانوں کو مار چکے ہیں اور دس بیس کو شدید زخمی بھی کر چکے ہیں۔

چشم دید گواہوں کے مطابق شوکت نام کا ایک مقامی لڑکا بھی ان کے ساتھ

تھا۔ باقی دو اجنبی تھے، چوبیس گھنٹے تک ان کے ساتھ لوہا لینے کے بعد بھی قرب و جوار کے ماہر اور خصوصی ٹریننگ و تربیت والے جوانوں کی پلٹن انہیں قابو میں نہ کر سکی۔ اب ایک سرحدی علاقے سے میجر تھاپہ کو بلایا گیا، جنہیں ایسے معاملات کے ساتھ نمٹنے کی خاص مہارت ہے۔

سو سوا سو کمروں والی تین چار منزلہ اس نئی سرکاری عمارت سے وقفے وقفے سے گولیاں چلنے کی صدائیں فضا میں گونجتی رہتی ہیں اور فضاء میں خوف و ارتعاش پیدا کرتی رہتی ہیں اور چاروں طرف سے اس عمارت کو گھیرنے والے آرمی اور پولیس کے جوان بھی فوراً ہی اس کا جواب دیتے ہیں اور بھر پور ڈھنگ سے دیتے ہیں۔

۳۶ر گھنٹے گذر جانے کے باوجود بھی ابھی تک صورتِ حال جوں کی توں بنی ہوئی ہے۔ سارا میڈیا Live اس کی کوریج میں لگا ہوا ہے اور اس کی رپورٹنگ کر رہا ہے سرکار اور سکیورٹی ایجنسیوں کی ناک کٹ رہی ہے کہ پوری سرکاری مشینری تین آدمیوں کو 36 گھنٹوں سے قابو نہیں کر پا رہی ہے اور ہر طرف سے زبردست دباؤ ہے اور چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔

میجر تھاپہ فوج کے ایک کم عمر آفیسر ہے اور پچھلے کئی برسوں سے اس طرح کے معاملات نمٹانے میں خاص شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ اسی لئے انہیں ایک سرحدی علاقے سے اس خاص مشن کے لئے بلایا گیا ہے کہ اب سب کی نظریں اسی پر لگی ہوئی ہیں۔ میجر تھاپہ نے اپنی جدید ترین مشین گن سے گولیاں برساتے ہوئے جونہی ایک محفوظ جگہ پر پوزیشن سنبھالی تو کچھ وقفے کے بعد ہی ایک گولی چیرتی ہوئی اس کی چھاتی میں پیوست ہو گئی اور اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور وہ وہیں پر ڈھیر ہو گئے۔

پاس پڑوس میں لڑنے والے دیگر فوجی اسے کھینچ کر باہر لے گئے اور ہر سمت صف ماتم بچھ گئی۔ اس محاصرے اور جنگ و جدال کو اب 48ر گھنٹے گذر چکے تھے

۔بالآخر توپ کے گولوں سے اس عمارت کو گرا کر ان تینوں نوجوانوں کو ابدی نیند سلا دیا گیا۔ جنہوں نے فوج کے دو میجروں اور کئی سپاہیوں کو مار دیا تھا اور دس بیس کو زخمی بھی کر دیا تھا اس معرکہ میں ایک سوئیلین بھی کام آ گیا تھا۔

اس کاروائی کے بعد آج صبح اس جلی ہوئی عمارت سے اپنی

بندوق تانے ہوئے ایک نوجوان باہر آیا تھا ۔اسے دیکھتے ہی چاروں اور سے اس پر گولیوں کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ جب اس کی لاش باہر لائی گئی اور اس کا گن چیک کیا گیا تو اس میں ایک بھی گولی نہیں تھی وہ خالی ہو چکی تھی۔ اس پر گولیوں کی بوچھاڑ کرنے والے پشیمان تھے کہ اسے زندہ ہی پکڑا جا سکتا تھا۔ خالی گن ہاتھوں میں لے کر مین گیٹ سے باہر آنے کی منطق کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی حالانکہ یہ شخص اپنے آپ کو زندہ بھی گرفتار کر وا سکتا تھا اور فلحال بچ بھی سکتا تھا لیکن جان بوجھ کر موت کو زندگی پر ترجیح دینا۔۔۔۔۔۔؟ جبکہ اڑتالیس گھنٹوں تک مسلسل بھوکا پیاسا رہنے کی وجہ سے اس کا پیٹ بھی اس کی کمر سے چپک سا گیا تھا۔





پانچ سو کا نوٹ

پیشے سے وہ ترکھان تھا۔عمر رسیدہ تھا۔جانکار لوگوں کے مطابق وہ بہت جہاندیدہ شخص تھا اور اب بڑھاپے کی وجہ سے ایک کنارے پر بیٹھ کر اس نے جیسے سب کچھ تیاگ دیا تھا اور خاموشی سے وہ سب دیکھ رہا تھا اور جانچ رہا تھا بالکل ایسے ہی، جیسے اس نے کچھ نہیں دیکھا ہے کچھ نہیں جانچا ہے اور اسے کسی کے ساتھ کوئی سروکار ہی نہیں ہے۔

اسے اس جہانِ فانی سے رحلت کئے ہوئے پندرہ بیس برس ہو گئے ہونگے لیکن آج بھی اس کا چہرہ، شکل وصورت، سراپا، بات چیت کرنے کا رنگ ڈھنگ جیسے میری نظروں کے سامنے ہی ہے۔اور اس کی آواز کانوں میں گونج رہی ہے۔اس کی ہربات، ہرانداز، اور ہر حرکت، مخصوص اور منفرد و معنی خیز ہوا کرتی تھی۔

ایک چھوٹے سے کچے گھر میں وہ اور اس کی بیگم رہا کرتی تھی۔شادی

کے بہت برس بعد جب انہیں کوئی بچہ نہیں ہوا تو انہوں نے اپنے ہی رشتے کے ایک بچے کو گود لیا اور اس کی پرورش کرنے لگے۔ ایسا کرتے کرتے ہی وہ دونوں میاں بیوی بوڑھے ہو گئے اور ان کا منہ بولا بیٹا بھی شادی کے بعد ہی ان سے الگ رہنے لگا اور اپنی گھر گرہستی میں انہیں بھول بھی گیا۔

اس دوران اس پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا اس کی فرمانبردار، خدمت گذار اور نرم مزاج بیوی کا انتقال ہو گیا جس کی جدائی نے اسے مزید نڈھال و تنہا کر دیا۔

ہمارے گھر محمد سلطان نجار جسے محلے بھر کے لوگ 'وستہ سلہ' کہا کرتے تھے، کا آنا جانا تھا۔ کچھ کھاتے پیتے نہ تھے بس اپنا دکھ درد بانٹنے کے لئے گاہے بگاہے آیا کرتا تھا اور کچھ دیر بیٹھ کر، اپنا جی ہلکا کر کے چلے جاتے تھے۔ ھمدرد و غمگسار بیگم کے انتقال کے بعد وہ اور بھی کمزور و نحیف ہو گئے تھے۔ اب نہ آنکھوں کی بصارت ہی ساتھ دیتی تھی اور نہ اب بن سہارے کے ہی چلا جاتا تھا۔

ایک دن اس کے منہ بولے بیٹے کو پتہ نہیں کس خیال نے اسے اپنے گھر بلانے کے لئے اکسایا؟ شاید اس کی نظر اس کی جھونپڑی پر تھی کہ وہ اسے اپنے گھر لے آیا۔

اسی دوران ہم تک یہ بات پہنچی کہ وستہ سلہ علیل چل رہا ہے چھٹی کا دن تھا بیگم صبح صبح ہی مزاج پرسی کے لئے ان کے ہاں چلی گئی۔ گھر پہنچنے پر جب میں نے بیگم سے وستہ سلہ کی خیریت دریافت کی تو اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اس سے کچھ بولا نہ گیا میرے اصرار پر ذرا سنبھلتے ہی کہنے لگی کہ وستہ سلہ انتہائی خستہ حالت میں ہے ابتدا میں، میں یہ سمجھا شاید اس کی حالت خستہ اور خراب ہے اور اس کی صحت جواب دے چکی ہے لیکن فوراً ہی میری غلط فہمی دور ہو گئی کہ اس کے منہ بولے بیٹے کا رویہ اس کے تئیں ٹھیک نہیں ہے اور اس کی جورو بھی اس کی طرف دار ہے۔ انتہائی نامناسب اور ناشائستہ

الفاظ تک ان کے بارے میں استعمال کر رہے ہیں ذرا سا بھی خوف خدا نہیں ہے اور نہ ہی اس شخص کے احسانوں کا کچھ احساس یا پاس ہے جس شخص کا انہیں ممنون و احسان مند رہنا چاہئے تھا اس کو یہ بات بات پر کوس رہے ہیں یہاں تک کہ برا بھلا کہنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

بیگم کی آنکھیں پھر۔۔۔۔۔۔۔۔؟ اور اب وہ خاموش ہو گئی تھی۔

ایک آدھ ہفتہ بعد ہم دونوں دوبارہ ان کے ہاں مزاج پرسی کے لئے گئے۔ وستہ سلہ کی بینائی اب اس حالت میں نہ تھی کہ وہ آنے والوں کو پہچان لیتے۔ وہ یا تو باتوں سے پہچان لیتے تھے یا پھر اسے بتانا اور سمجھانا پڑتا تھا کہ کون آئے ہیں۔

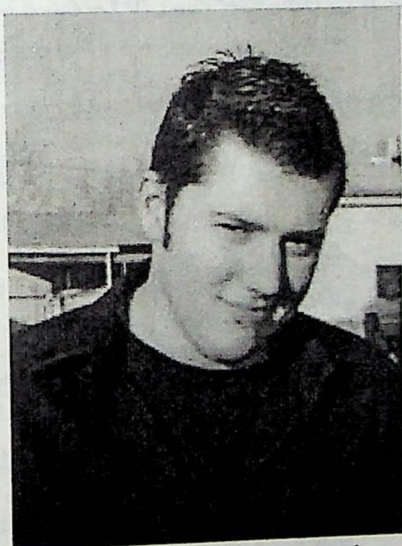
جونہی انہیں ہماری آمد کے بارے میں پتہ چلا تو انتہائی خوش ہو گئے اور گھر کے ہر فرد کے بارے میں دریافت کرنے لگے ایک آدھ گھنٹہ ہمارے ساتھ دھیمی آواز میں ڈھیر ساری باتیں کرتے رہے اور بچوں کے بارے میں دریافت کرتے رہے۔ ان سے رخصت ہوتے وقت باہر برآمدے میں بیٹھے ان کے بیٹے اور بہو سے بھی مڈبھیڑ ہو گئی چلتے چلتے باتوں باتوں میں اس کی بہو اپنے شوہر کی موجودگی میں، بیگم سے اپنے بیمار سسر کی عیب جوئی کرتے ہوئے کہنے لگی۔ ''بوڑھے کا دماغ سٹھیا گیا ہے، کچھ دن قبل میرے بیٹے جاوید سے تکیہ کے نیچے سے پانچ سو کے نوٹ کے غائب ہو جانے کی بات اس طرح بار بار پوچھتے رہے، جیسے اسی نے چرائے ہوں، دیکھا میرے بیٹے پر چوری کا الزام لگا رہا تھا؟۔ اٹھنے بیٹھنے سے معذور تو کب کا ہو چکا ہے، بینائی بھی جواب دے چکی ہے اور اب اس کی یاداشت بھی۔۔۔۔۔؟!، بوڑھے کھوسٹ کے پاس پانچ سو کا نوٹ کہاں سے آجاتا کہ اسے اس کے تکیے سے کوئی اڑا لیتا۔ آپ ہی سے پوچھتی ہوں کیا میرا بیٹا جاوید ایسا ہے؟۔''

پاس ہی کھڑے اس کے شوہر نے جورو کی بات کی تائید میں سر

بلاتے ہوئے مزید کچھ نازیبا الفاظ زبان سے نکالے۔

دروازے سے نکلتے نکلتے میں نے بیگم کے چہرے اور اس کی آنسوں سے پر آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اور میں نے یہ محسوس کیا کہ وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی لیکن کہہ نہیں پا رہی ہے۔ یہاں تک کہ ہم ان کے صحن سے باہر آ گئے۔ میں نے موقعے کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے بیگم سے یہ نہیں پوچھا کہ وستہ سلہ کے پاس وہ پانچ سو کا نوٹ کہاں سے آیا تھا؟! کیونکہ اس کے چہرے کے خدوخال سے سب کچھ واضح ہو گیا تھا؟۔





یہ سب تمہارا کرم ہے۔۔۔۔۔؟

سولہ سترہ برس کی عمر کا ایک خوبصورت، تندرست اور اسمارٹ نوجوان میرے کیبن میں داخل ہو کر میرے سامنے ہی رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر مجھے اپنی تکلیف کے بارے میں بتانے لگا اور میں بڑے انہماک کے ساتھ اس کے چہرے کو تکنے لگا۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ میرے پاس پہلی بار اپنا علاج کرانے آیا ہو؟ اس کی پوری فیملی میرے پاس اس غرض کے لئے آتی ہی رہتی ہے لیکن نہ جانے آج مجھے پرانی باتیں کیوں یاد آنے لگ گئیں؟

یہ لڑکا جب جب بھی میرے سامنے سے گذرتا ہے تو اکثر میری سوچ انیس بیس

سال پیچھے چلی جاتے ہے میں نے ، اپنے کلنک میں آج کے اس آخری مریض کی پریشانیاں سن کر سرسری طور پر اسے دوائیاں وغیرہ بھی تجویز کیں اور پرچہ اس کے ہاتھ میں تھمادیا وہ اب میرے کیبن سے باہر آ گیا تھا لیکن اس کے باہر جاتے ہی، میں ایک عجیب مخمصے میں مبتلا ہو گیا؟۔

لگ بھگ بیس برس کا عرصہ گذر گیا ہوگا کہ اس لڑکے کا باپ محمد یوسف میرے کیبن میں پہلی بار اسی طرح اپنا علاج کرانے کے لئے داخل ہو گیا تھا۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے جیسے کل ہی کی بات ہو، اس کی شادی کو دو تین سال ہو گئے تھے کوئی بچہ نہ ہونے پر دونوں میاں بیوی متفکر و پریشان تھے ۔ میرے پاس علاج کے لئے آ گئے تھے اور مجھے اپنی بپتا سنانے لگ گئے تھے۔

حسبِ معمول میں نے کچھ ٹیسٹ وغیرہ لکھ دئے ۔ کچھ دن بعد جب رپورٹ لے کر وہ دوبارہ آئے ۔ تو ان میں صاف طور پر لکھا ہوا تھا کہ محمد یوسف میں بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں ہے اور وہ اس سے عمر بھر محروم ہی رہ سکتے ہیں کہ اس کی اس خلقی خامی کا کوئی علاج نہیں ہے۔ جب میں نے ذرا قاعدے سے یہ بات میرے سامنے بیٹھے ہوئے مریض کو سمجھا دی تو وہ جیسے اپنے ہوش و حواس پر قابو کھو کر نابالغ بچوں کی طرح زور زور سے رونے لگ گیا۔ میرے لئے یہ سب ناقابلِ یقین تھا ،مرتا کیا نہ کرتا میرا OPD مریضوں سے کھچا کھچا بھرا ہوا تھا میں اٹھ کر اسے تسلی دینے لگا کہ ٹیسٹ ایسے ہیں تو کیا ہوا؟ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا، پریشان ہونے کی قطعی کوئی بات نہیں ہے؟ میں یہ چاہ رہا تھا کہ یہ کسی بھی طرح خاموش ہو جائے کیونکہ کیبن سے باہر اپنی باری کا انتظار کرنے والے سب مریض ہماری طرف متوجہ ہو رہے تھے۔

جوں توں کر کے یہ صاحب خاموش ہو گئے اور بار بار مجھ سے پوچھتے رہے کہ اب کیا ہوگا۔ بہر حال میں نے کوئی دوائی تھما کر اسے رخصت کر دیا۔ اس کے بعد وہ کچھ عرصہ تک

زیرِ علاج رہا یہاں تک کہ اس کی ہاں پہلا بچہ پیدا ہو گیا جو یہی لڑکا تھا جو ابھی میرے کیبن سے علاج کر کے نکلا ہے اور اس کے بعد محمد یوسف کے ہاں تین چار بچے ہو گئے اور اتفاق سے سب کے سب نرینہ ہی۔

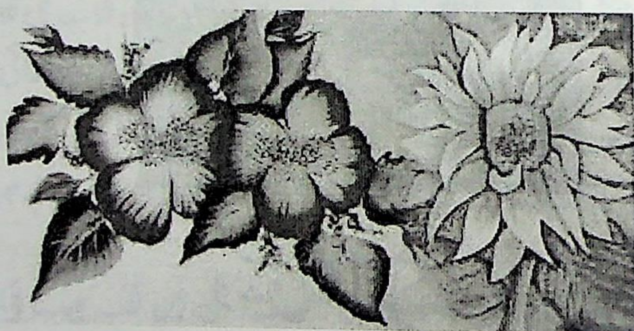
محمد یوسف اس دن سے ہی علاج و معالجے کے لئے میرے پاس آتا رہتا ہے گھر کے کسی بھی شخص کی

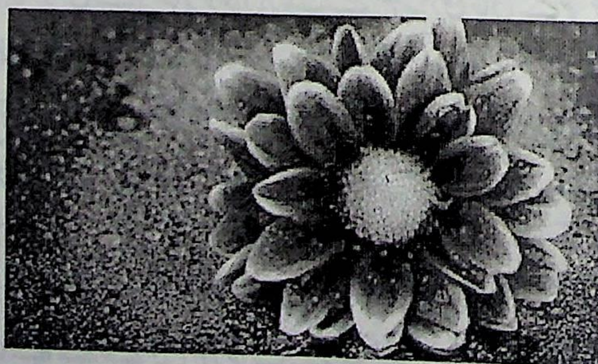
صحت سے متعلق زرا سی پریشانی پر میرا مشورہ لیتا ہے پھر دوسرے طور طریقے اپنائے جاتے ہیں۔ محمد یوسف پڑھا لکھا نہیں ہے اکثر فرصت کے لمحات میں میرے ساتھ روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے معاملات پر بھی بات کر لیتا ہے۔

ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے میں مریضوں سے فارغ ہو چکا تھا کہ محمد یوسف میرے کیبن میں داخل ہو گیا کسی بچے کی کوئی پرابلم بتانے لگا میں نے بھی سرسری طور پر کوئی دوائی پرچے پر لکھ کے دے دی۔ مجھے فراغت سے بیٹھے ہوئے کچھ دوسری باتیں کرنے لگا میں بھی ہاں ہوں میں جواب دینے لگا۔ باتوں باتوں میں اپنے بڑے فرزند کے بارے میں بتانے لگا کہ انٹرنس میں ایک آدھ نمبر سے رہ گیا ہے۔ جس کا انہیں بہت صدمہ ہے اور خود اس کا بچہ بھی اس صورتِ حال سے کافی مایوس ہے۔

میں نے محمد یوسف کو حوصلہ دلاتے ہوئے مایوس نہ ہونے کی صلاح دی اتفاقاً مجھے وہ دن یاد آ گیا جب محمد یوسف میرے اسی کیبن میں اسی جگہ پر، جہاں وہ اس وقت بیٹھا ہوا تھا زار و قطار رونے لگا تھا۔ لیکن اتنا وقت گذر جانے کے بعد اسے کہاں یاد ہوگا کہ ایسا بھی کبھی ہوا تھا۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ اس کا ذکر ہی نہ کیا جائے پھر بھی نہ جانے میرے اندر ایک تجسس سا کیوں پیدا ہو گیا کہ میں جاننا چاہتا تھا کہ اگر اس بات کو میں آج تک نہیں بھولا ہوں اور گذرتے ہوئے وقت کی دھول مٹی اس واقعے کو میرے ذہن و دل سے دھندلا نہ سکی حالانکہ اس کا تعلق یا وابستگی میری ذات سے اتنی اہم بھی نہیں

ہے جتنی میرے مریض محمد یوسف سے ہے۔میں شاید یہ بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ کیا محمد یوسف کی یاداشت میں یہ واقعہ آج تک موجود ہے یا پھر وہ اسے بھول چکے ہیں۔
جونہی محمد یوسف کو یہ بات یاد آ گئی تو اس نے فوراً ہی اس پورے واقعے کو ہو بہو دھرا دیا میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی کہ کم از کم یہ صاحب میرے اکثر مریضوں کی طرح احسان فراموش تو نہیں ہیں بھلے ہی یہ اس کا اظہار نہ کریں اور پھر یہ واقعہ اتنا پرانا ہے کوئی نیا تازہ واقعہ بھی نہیں ہے۔







دیسی گلاب

وادی کشمیر کے دیسی گلابوں کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے انہی کے رنگ کو کسوٹی بنا کر کسی کے رخسار کو گلابی رنگ سے تشبیہہ دی جاتی ہے تو کسی کے ہونٹوں کو ان کی پنکھڑیوں سے، بڑے نرم ونازک ہوتے ہیں اور ان کی خوشبو کے کیا کہنے ناک سے لگتے ہی جب سانس ان کی خاشبو کے ساتھ اندر چلی جاتی ہے تو اندر تک روح کی گہرائی میں اتر جاتی ہے اور قلب وروح کو فرحت وتسکین کا احساس دلاتی ہے اور روم روم کو معطر وعنبرین بنادیتی ہے۔

سردیوں کے موسم کے جاتے ہی موسم بہار کی آمد کے ساتھ ہی ان کے خوبصورت غنچے نکلنے لگتے ہیں اور گلاب کے پودے پر چاروں جانب دکھائی دینے لگتے

ہیں یہی وقت بارشوں اور ہواؤں کا بھی ہوتا ہے سبز مخملی گھاس شدید سردیوں میں برف باری سے جیسے بنجر بن چکی ہوتی ہے اور اب زمین کے چپے چپے پر سرسبز گھاس اور رنگ برنگے گلابوں کی ہریالی چھائی ہوئی ہوتی ہے، سنہری دھوپ کے نکلتے ہی، عجیب طرح کا ماحول پیدا ہونے لگتا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید کسی اور ہی دنیا میں آ گئے ہیں جس کا چپہ چپہ جنت سے مشابہت رکھتا ہے۔

تیس چالیس سال قبل باغ باغیچوں اور بڑے بڑے گھروں کے کشادہ صحنوں میں یہاں تک کہ ندی نالوں کے کناروں پر بھی دیسی گلاب کی کانٹے دار جھاڑیوں کے خودرو جنگل اگ آیا کرتے تھے جہاں اس موسم میں چارسو گلاب ہی گلاب نظر آتے تھے۔صبح سویرے گلاب کی پنکھڑیوں پر شبنمی قطرے موتیوں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ آج ان گلابوں کا اور ایک مصرف بھی ہے کہ ان سے عرق اور تیل بھی کشید کیا جاتا ہے جو بہت مہنگا بکتا ہے۔اس لئے اسے ایک صنعت کا درجہ مل چکا ہے کہ ہر جانب بیکار زمینوں پر گلاب ہی گلاب نظر آنے لگے ہیں۔

گلاب جو خوبصورت ہیں جو مہکتے ہیں مسکراتے بھی ہیں لگ بھگ ایک ہی قد و قامت، شکل وصورت اور رنگ و بو والے گلاب ہوتے ہیں بالکل ایسے ہی جیسے اسکولوں ،کالجوں کے یہ گبرو نوجوان لڑکے لڑکیاں۔۔۔۔؟ خوبصورت، تنومند، صاف و شفاف صورت و سیرت اور ظاہر و باطن والے، مسکراتے اور ہنستے کھلتے چہروں والے دوڑتے بھاگتے پھرتیلے اور ہر طرح اور ہر سمت نظر آنے والے گلاب۔۔۔۔۔؟ ٹیر گیس کی مرچی والے تلخ دھویں سے جن کی آنکھوں سے نکلنے والے آنسوں کی دھار، صبح کے وقت گلابوں پر اوس کی پھار جیسی۔

اپنے باغ باغیچوں میں گلاب کے پودے لگانے والے جب ایک بڑے تھیلے میں کاٹ کاٹ کر انہیں جمع کر کے ایک بڑے ترپال پر پھینک دیتے ہیں تو وہ

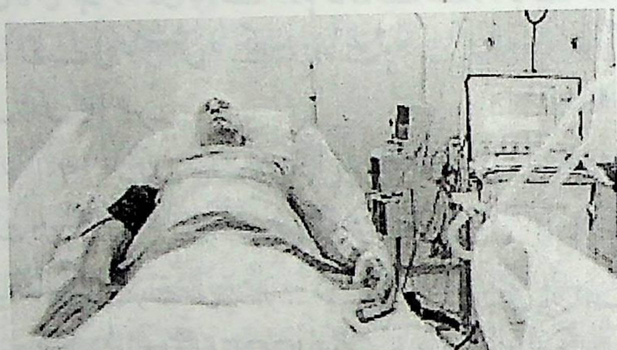
منظر بہت ڈراونا ہوتا ہے۔ جو گلابوں سے پیار کرنے والوں کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ ترپال پر جب بے حرکت گلابوں کا ڈھیر لگ جاتا ہے اور پاس پڑوس میں گلابوں کے پیڑ ایسے سوگوار دکھتے ہیں جیسے ہاتھ کٹے ہوئے بازوں ہوا میں لہرا کر چیخ و پکار کر رہے ہوں اور ان کی آہ و بقاء کوئی سنتا ہی نہیں ہے اور نہ کوئی اس جانب توجہ ہی دیتا ہے۔ جیسے وہاں کھڑے سب لوگ اندھے، گونگھے اور بہرے ہو چکے ہیں۔

سب گلاب اکھٹے کرکے جب سمیٹ سمیٹ کر گاڑیوں میں لاد کر فیکٹری میں لے جائے جاتے ہیں تو یہ باغ باغیچے اور بھی ویران و سنسان ہو جاتے ہیں۔

گلاب کے پودے اور ان کی نرم و نازک شاخیں، لگنے والے ایک ایک زخم، ایک ایک کھروچ اور خراش کی ٹیس اپنے وجود کی گہرائیوں میں محسوس کرتے ہیں۔

کچھ دن بعد۔۔۔۔۔۔۔۔۔ جب گلاب کاٹنے والے پھر سے ان باغیچوں میں نمودار ہو جاتے ہیں تو سارے پودے پھر سے سہم سہم جاتے ہیں کہ ان کی نظریں نئی کونپلوں کو گھورنے لگتی ہیں۔





یادوں کے دریچے

میڈیکل انسٹچوٹ کے ICU میں مسٹر ایک مردہ لاش کی طرح بیڈ پر پڑے ہوئے تھے فرق صرف اتنا تھا کہ بس سانس کی ڈور ابھی چل رہی تھی ٹوٹی نہیں تھی۔ ICU کے اس انتہائی نگہداشت والے کمرے میں اکثر کسی کو جانے نہیں دیتے ،ہیں اندر تو آ گیا تھا لیکن کئی مشینوں سے جڑی اس مردہ لاش کو دیکھ کر سہم سا گیا تھا سب واقعات میری آنکھوں کے سامنے فلم کی طرح گھومنے لگے تھے، جب بستر مرگ پر پڑا یہ شخص، ہمارے شہر کے پولیس محکمے میں ایک کلیدی عہدے پر فائز تھے کہ مکھی تک کو اپنے چہرے پر بیٹھنے نہیں دیتے تھے، اور جو بات کہتے تھے خواہ وغلط ہوتی تھی یا درست، اسے ہر حال میں پورا کر کے ہی دکھا دیتے تھے۔ چاہے دنیا ادھر ادھر ہی کیوں نہ چلی جاتی۔ یہ بس پتھر کی لکیر بن کر ڈٹے رہتے تھے۔

اور آج۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟ ایک بے جان مٹی کے ڈھیر کی طرح ہی اس بیڈ پر پڑے ہوئے ہیں بے بس و مجبور۔۔۔؟ جو نہ جانے کس

گھڑی کا انتظار کر رہے ہیں اور پھر اس حال میں بھی ان کا خیال رکھنے والے ان کے قریبی لوگ بھی لاش کہہ کر انہیں چھونے اور ہاتھ لگانے سے ڈر جائینگے اور انہیں جلد از جلد ٹھکانے لگانے کی کوشش کرینگے۔ زندہ تھے تو سب کچھ اور مردہ ہو گئے تو کچھ بھی نہیں بس ایک خاک کا ڈھیر۔

یہ لگ بھگ تیس سال پرانی بات ہے جب میں اس شہر کا ڈی سی تھا۔ ایک دن صبح صبح میرے آفس میں محکمہ پولیس کا ایک زمہ دار آفیسر ایک اہم فائل لے کر آیا تھا۔ فائل میرے ٹیبل پر میرے سامنے رکھ کر مجھے یہ بھی یاد دلانے لگے کہ یہ فائل انتہائی اہمیت کا حامل اور URGENT بھی ہے جو آج کیا بلکہ ابھی ویٹ ہو کر واپس جانا چاہیئے۔

میرے آفس سے بھی یہ فائل میری طرف صرف دستخط کے لئے فارورڈ ہو کر آیا تھا۔ یہی اس آفس کا دستور تھا میں چونکہ ابھی نیا نیا ہی تھا اسلئے مجھے یہ طور طریقے سکھائے جاتے تھے۔

مذکورہ پولیس آفیسر کی اسطرح کی جلد بازی اور پھر آفس والوں کے یہ طور طریقے مجھے کچھ اچھے نہیں لگے اور پھر میں اسطرح کے ماحول کا عادی بھی نہیں تھا کہ مجھے عمر بھر اپنے ہی ڈھنگ سے کام کرنے کی عادت تھی اسلئے میں نے پولیس آفیسر کو خالی ہاتھ، یہ کہہ کر لوٹا دیا کہ میں فائل پڑھکر واپس کر دوں گا جو اس کے لئے بالکل غیر متوقع تھا۔ لیکن وہ اس پوزیشن میں بھی نہیں تھا کہ اور کچھ کہہ کر مجھ سے دستخط کرواتا۔ کیونکہ میں اسے یہ بات صاف طور پر باور کرا چکا تھا کی میں یہاں ڈی سی کا کوئی ڈیجٹل مہر یا ٹھپہ نہیں ہوں کہ جہاں چاہوں لگا سکتے ہو اور نہ ہی میں دوسروں کے مشورے سے چلتا ہوں خود دیکھتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔۔۔۔؟!۔

Yes Sir, کہہ کر وہ پولیس آفیسر میرے کمرے سے چلا تو گیا لیکن میرے

آفس سپرانٹنڈنٹ کو اندر بھیج کر مجھے ڈرانے دھمکانے میں کامیاب ہو گیا جو پریشانی کی حالت میں اندر آ کر مجھے اس طرح کے اقدامات کے نتیجوں سے آگاہ کرنے لگا۔ میں نے اپنے موقف پر ڈٹے رہنے کا ارادہ جتا کر فائل اپنے ساتھ گھر لے جا کر اس کو توجہ سے پڑھنے کی خواہش کا اظہار کر دیا۔

یہ ان چودہ پندرہ نوجوانوں کا فائل تھا جنہیں ہمارے شہر کے مختلف پولیس تھانوں سے گرفتار کیا گیا تھا۔ اور حوالات میں مروجہ قانون کے ایک خاص ایکٹ کے تحت قید کر لیا گیا تھا۔ جس کے مطابق دو سال تک ان کی ضمانت اور نہ رہائی ہو سکتی تھی اور نہ ان کے کیس کی کوئی شنوائی یا مزاحمت ہی ہو سکتی تھی انہیں بغیر پوچھے ہی دو سال تک جیل میں رکھا جا سکتا تھا اور پھر دو سال بعد ان کی سنی جا سکتی تھی۔ اس طرح کے کسی بھی کیس پر متعلقہ ڈی سی کے دستخط قانونی ضرورت تھے۔

میں نے فائل کا انتہائی گہرائی سے مطالعہ کیا اور ہر مقید نوجوان کے کیس پر ہر زاویے سے سنجیدگی کے ساتھ نظر دوڑائی اور ہر ایک فائل میں طرح طرح کے نافذ العمل قانون کی رو سے نقائص دیکھے اور ان پر تفصیلی نوٹ لکھ کر پولیس محکمے کو فائل واپس بھجوا دیا حالانکہ میرے آفس کے کچھ میرے ماتحت ملازم میرے اسطرح کے اقدام سے خوش نہ تھے کیونکہ انہیں یہ کسی بڑے خطرے کا سگنل لگ رہا تھا لیکن ایک میں تھا کہ مجھے اسطرح کے خطروں سے کھیلنے میں مزا آجاتا تھا۔

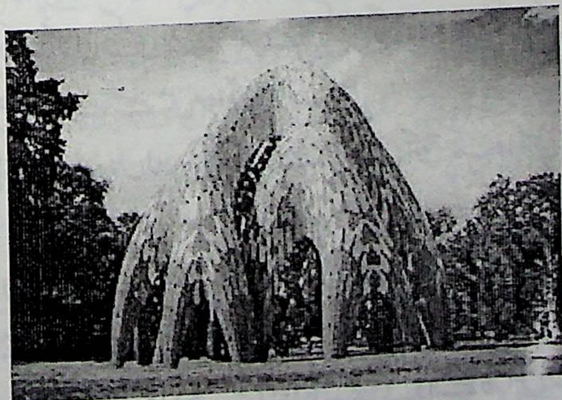
پھر کیا ہونا تھا وہ دن اور یہ دن۔۔۔۔؟ وہ فائل آج تک واپس ہی نہیں آیا

ایک عرصہ بعد ICU میں بغیر سدھ بدھ کے پڑے ہوئے یہ پولیس آفیسر ایک دن مجھے ایک سرکاری فنکشن میں مل گئے فرصت کے لمحات میں ادھر ادھر کی باتوں باتوں میں اس فائل کا ذکر بھی کسی طرح سے چھڑ گیا۔ میرے بار بار کریدنے اور ان کی کچھ زیادہ ہی پی جانے کی وجہ سے انہوں نے اس واقعے کا مکمل خلاصہ کر لیا جو ایک

عرصہ سے میرے لئے ایک معمہ بنا ہوا تھا۔ کہنے لگے کہ۔۔۔۔۔۔۔۔؟

"میرے سینئر مجھ سے خوش نہیں تھے کہ میں ایک مدت سے کوئی کارنامہ انجام نہیں دے پا رہا ہوں۔ انہیں خوش کرنے کے لئے میں نے اپنے چند ماتحت آفسروں کی مدد سے اپنے حدود میں آنے والے چند پولیس تھانوں میں چھوٹے موٹے جرائم میں قید چودہ پندرہ نوجوانوں کا مذکورہ فائل تیار کروا کر انہیں اس بدنام زمانہ ایکٹ میں بک کرنے کی خاطر، قانونی ضرورتوں کے پیشِ نظر Approval کے لئے اسے اپنے شہر کے ڈی سی صاحب کے پاس بھیجا تھا جو وہاں سے بے رنگ ہی واپس آ گیا۔ جو عام حالتوں میں نہیں ہوتا تھا۔

ICU کے انتہائی نگہداشت والے کمرے میں پڑے اونچی رینک کے اس بے حس و حرکت مریض کے سیاہی مائل نیم مردہ چہرے پر میری نظریں گڑھی ہوئی تھیں میں نے تحقیر آمیز نظروں سے ایک بار اسے پھر دیکھا اور وہاں سے باہر آ کر اپنی یاداشت کو کوسنے لگا کہ اس واقعے کو بھی ابھی یاد آنا تھا۔۔۔۔۔۔۔؟؟!! لیکن کیا کیا جائے یادوں کے دریچوں کو مقفل نہیں کیا جا سکتا۔ ہوا کے ذرا سے جھونکے سے کھل جاتے ہیں تو کھلے ہی رہ جاتے ہیں۔





جنگ جاری رہیگی ۔۔۔؟

بوڑھے اور لاچار والدین کے لئے وہ گھڑی انتہائی صبر آزما ہوتی ہے جب کوئی جانکار، بھاگتا دوڑھتا، ہانپتا ہوا آکر انہیں یہ اطلاع دے کہ ان کے نوجوان بیٹے کو شہید کر دیا گیا ہو اور وہ داعی اجل کو لبیک کہہ گیا ہو۔

یہاں اس خاک وخون میں لپٹی ہوئی وادی میں اس طرح کو والدین لاتعداد ہیں جن میں رمضان اور اس کی بیگم بھی شامل ہیں۔ رمضان دو بار اس مرحلے سے گذرا ہے اور اس کے دو گبرو جوان اس معرکۂ حق وباطل میں کام آئے ہیں۔

عرفان اور عدنان پہلے ایک اور پھر ایک سال بعد دوسرا بھی، ان کی آنکھوں کی بینائی، بڑھاپے کی لاٹھی، ان سے چھین لی گئی، انہیں بے سہارا کر دیا گیا اور زندگی بھر انہیں ایک ایسا زخم دیا گیا جو کبھی مندمل نہیں ہوگا جس کا ناقال برداشت درد ان کی روح کی گہرائیوں میں اتر کر انہیں ہمیشہ تڑپاتا اور کراہتا رہیگا۔

رمضان اوراس کی بیوی اب جیسے اس دنیا اور مافیہا سے متنفر، ناامید اور مایوس ہو چکے ہیں یہاں تک کہ کھانے پینے اٹھنے بیٹھنے سے بھی معذور و بے بس سے نظر آتے ہیں۔اس سب کے باوجود اگر انہیں کوئی شئے ذرا سا متحرک ومصروف رکھتی ہے تو وہ صرف اور صرف اپنے بڑے بیٹے کے دو کم سن بیٹوں کے مستقبل کی فکر اور ان کی پرورش و خبر گیری کا غم تھا ورنہ یہ دونوں میاں بیوی کب کا سب کچھ تیاگ کر نہ جانے کن دشاؤں کی طرف نکل پڑے ہوتے اور ہر ایک خواہش اور تمنا کو خیر باد کہہ چکے ہوتے۔

شمیم اور وسیم ان کے بڑے بیٹے عرفان کے دو بیٹے تھے ان کی ماں زینب چند ماہ قبل ایک دلدوز حادثے میں انتقال کر چکی تھی اور اب یہ دونوں یتیم دادا دادی کی پرورش میں تھے۔

جن حالات میں ان کے والد کو بڑی بے دردی اور سفاکانہ طور پر شہید کر دیا گیا تھا یہ دو معصوم ان حالات کے چشم دید گواہ تھے کہ کس طرح دن دھاڑے انہیں گھر سے گھسیٹ کر سب کے سامنے مار ڈالا گیا تھا کہ کوئی کچھ نہ کر سکا تھا خاک وخون میں لت پت اس کے مردہ شریر کو گھسیٹ کر آنگن میں رکھا گیا تھا اور وہیں پر تب تک رکھا گیا تھا، جب تک نہ وہ موت کے سوداگر وہاں سے بھاگ گئے تھے یہ سب بے بسی ان دو معصوم بچوں کے ذہن و دل میں گھر کر چکی ہے اور یہ ہمیشہ سہمے سہمے سے اور ڈرے ڈرے سے رہتے ہیں اس واقعے کا خوف اور دہشت ان کی رگ رگ میں سرائیت کر چکا ہے اوران کے پھول جیسے چہروں سے بشاشت و رونق اور ان کے پھول جیسے لبوں سے مسکراہٹ ہمیشہ کے لئے چھین چکا ہے۔

دونوں بھائی دادا دادی کی دلجوئی کے لئے اسکول جاتے ہیں ورنہ انہیں ان ہنگاموں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ یہ دونوں بھائی زندگی کے ساتھ پہلے ہی راونڈ میں جنگ ہار چکے ہے پھر بھی ہارے ہوئے کھلاڑیوں کی طرح جوں توں کر کے میدان میں

ڈٹے ہوئے ہیں یا پھر ڈٹے رہنے کی ایکٹنگ کر رہے ہیں۔

جب دونوں دھڑوں کا موقف ناقابلِ لچک ہو اور دونوں میں سے کوئی اپنے موقف پر ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے کا سوچ بھی نہیں سکتا ہو تو پھر آپسی رسہ کشی اور اختلاف کیسے ختم ہوگا؟ وہ تو اور بھی الجھ کر زیادہ پیچیدہ بن جائے گا کہ باہمی افہام و تفہیم کی کوئی صورت نہیں نکل آئے گی اور کمزور و طاقتور کی یہ جنگ حرارت پکڑتی رہیگی اور سفاکانہ قتل و غارت گری سے اور وقتی طور پر ٹھنڈی ہوجاتی رہیگی، پھر طاقتور مونچھوں پر تاؤ دیکر اپنی جیت پر فخر کرتا رہیگا اور کمزور لاشوں کو سمیٹنے میں لگ جائے گا دونوں یہیں پر بس نہیں کرینگے یہ سلسلہ جاری رہیگا اور آگے بڑھتا رہے گا۔

دنیا کی تاریخ یہی بتاتی ہے اور یہی سکھاتی ہے کہ اکثر پہلے بدی ہی جیت جاتی ہے اور کبھی کبھار نیکی بھی غالب آجاتی ہے لیکن تب تک سب کچھ خاک میں مل چکا ہوتا ہے۔

رمضان بھی آخر انسان ہی تھا اپنے بیٹوں کی صورتیں اس کی نظروں کے سامنے ہمیشہ رہتی تھیں اور اس کی بیوی تو نہ جانے بچوں کی موجودگی اور غیر موجودگی میں دن بھر کتنی بار ان کا تذکرہ کرتی ہی رہتی تھی۔ حالانکہ رمضان نے بچوں کی موجودگی میں ایسا کرنے سے کئی بار اسے منع بھی کر دیا تھا کہ انہیں بار بار اس کا احساس نہ دلاؤ کہ وہ مزید غم زدہ اور رنجیدہ نہ ہوں۔ مگر ماں ------- اور پھر ماں کا دل ------ ؟؟!!۔

ہوا یوں کہ رمضان ایک دن اچانک شدید علیل ہو گیا اور کئی دنوں کیا کئی ہفتوں سے بسترِ علالت پر پڑا رہا اسی دوران حالات پھر ابتر ہو گئے۔ گلی گلی، محلہ محلہ پتھراؤ، کرفیو، ہڑتال، پکڑ دھکڑ، ہونے لگی پیلٹ گنوں کے دھانے کھول دئے گئے لاتعداد لوگ زخمی اور بینائی سے محروم ہو گئے اور زخموں کی تاب نہ لا کر شہید ہونے والوں کی تعداد بھی اچھی خاصی تھی اس تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔

رمضان کی صحت آج زیادہ ہی خراب تھی اور اس کی بیگم، اس

کے سرہانے بیٹھی لاتعداد اندیشوں میں گھر رہی تھی اور انتہائی پریشان بھی تھی کہ عدنان صبح سے نظر نہیں آ رہا تھا جبکہ عرفان علیل داد کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔ رمضان کی حالت لمحہ بہ لمحہ خراب وخستہ ہو رہی تھی پوتے کی غیر موجودگی اسے بھی بہت کھٹکتی تھی۔

باہر بہت شور شرابا تھا اور ٹرگیش شلوں اور پیلٹ گنوں کی گھن گرج اور کڑوا دھواں سارے ماحول کو اور بھی مکدر اور غلیظ کر رہا تھا جس سے رمضان کی دمکشی میں اور بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ سانس لینے پر اسے ہر سانس آخری سانس محسوس ہو رہا تھا۔

اس کی بیگم اس صورتِ حال سے بہت پریشان تھی کہ ان حالات میں وہ انہیں لے جائے تو کہاں لے جائے؟ پاس پڑوس والے گھروں میں بھی موت جیسا سکوت چھایا ہوا تھا۔ موبائل اور انٹرنٹ سسٹم بھی پہلے ہی سے جام کیا گیا تھا۔

اسی دوران دروازے پر کسی کے دستک نے جیسے ہلچل سی مچادی۔ تینوں اس جانب متوجہ ہو گئے معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ عدنان اور اس کے کئی دوست ہیں۔ عدنان کے سر پر کئی چوٹیں بھی آئی تھیں اور اس کا سر خون آلود تھا۔ اس کے دو تین ہمعمر دوست بھی اس کے ساتھ گھر میں آ گئے تھے۔

دادا دادی نے اطمنان کا سانس لیا کہ رمضان بسترِ علالت سے عدنان کی طرف عجیب نظروں سے متواتر دیکھنے لگا نہ جانے اس کے دل میں کیا کچھ تھا۔۔۔۔۔۔۔۔؟

اس دوراں عدنان کی مرحم پٹی بھی ہو چکی تھی وہ اور اس کے دوست اب فراغت سے رمضان کے بستر کے آس پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے۔

رمضان نے کمزور اور نحیف لہجے میں عدنان سے پوچھا۔

"بیٹا تمہارے سر پر یہ چوٹیں کیسے آ گئیں۔۔۔۔۔۔؟"

عدنان نظریں جھکائیں ہوئے خاموش رہا۔ اس سے کچھ جواب ہی نہیں بن پا رہا تھا۔ رمضان نے یہی سوال اس کے دوستوں سے مخاطب ہو کر دھرایا۔ ابتدا میں وہ بھی متحیر

آنکھوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ جب دوبارہ یہ سوال دھرایا گیا تو کہیں سے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے یہ آواز آ گئی۔

"دادا باہر سنگ بازی ہورہی ہے۔۔۔۔۔۔؟"

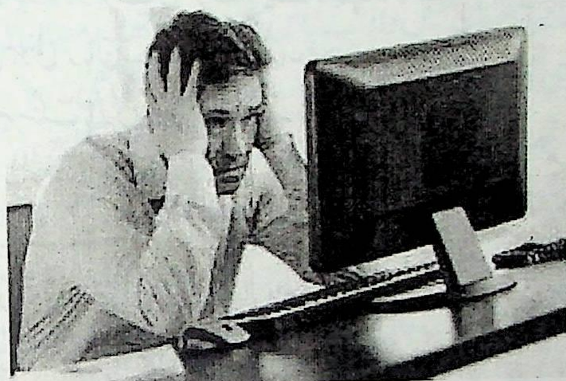
رمضان آواز کاٹتے ہوئے پھر پوچھنے لگا۔ تم بھی سنگ بازی میں۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟"

رمضان دمکشی اور کھانسی سے نڈھال ہوکر، ہانپتے ہوئے پھر وہی سوال دھرانے لگا۔ جس کا جواب اسے سر ہلا کر اثبات میں ملا۔

رمضان نے انتقال سے قبل لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے، جو آخری الفاظ دھرائے وہ کچھ اسطرح سے تھے

"اللہ کا شکر ہے آج عدنان پورے نو سال کا ہو گیا اس کے ماتھے پر یہ خون آلود زخم گواہی دے رہے ہیں کہ یہ جنگ کم از کم ابھی نصف صدی تک اسی شد و مد سے جاری رہیگی۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟؟" اناللہ وان الیہ راجعون





گرداب میں پھنسا میں

لگ بھگ چالیس سال تک ہسٹری جیسا خشک سبجکٹ پڑھانے کے بعد، ریٹائرمنٹ پر یہ امید بندھ گئی تھی کہ اب اطمنان کے ساتھ زندگی گزرے گی، نہ یونیورسٹی جانے کی جلدی ہوگی، نہ روز روز کسی نئے موضوع پر لیکچر دینے کے لئے گھنٹوں ذاتی کتب خانے میں کتابوں کے اندر سر کھپانا پڑے گا، نہ نئے ریسرچ اسکالروں سے میٹنگ اور نہ ہی امتحانی پرچے سیٹ کرنے یا مارکنگ وغیرہ کی کوئی پریشانی یا جنجھٹ ہی ہوگا؟ جو جی میں آئے گا کروں گا، گھوموں پھروں گا، سیر سپاٹے کو نکلوں گا، اطمنان سے لیٹے رہوں گا یا پھر حسبِ دستور اپنے ذاتی کتب خانے میں کتابوں کی ورق گردانی کروں گا یا پھر کچھ اور، مگر معروف یونیورسٹیز کے پروفیسروں کو، خاص طور پر اگر انہوں نے نام بھی کمایا ہو، کو ریٹائرمنٹ کے بعد بھی آرام کہاں نصیب ہوتا ہے؟ سکون نام کی کوئی چیز سے وہ واقف ہی نہیں ہوتے؟ کوئی نہ کوئی کام، کوئی نہ کوئی مصروفیت کہیں نہ کہیں سے نکل ہی آتا ہے۔ اچھی خاصی رقم اگر ملنے والی ہو تو منع بھی نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اسلے جو کچھ

کر سکتے ہیں کرتے ہیں اور ہاتھ بھی گرم کرتے رہتے ہیں۔

اب کے بار میری اسائنمنٹ پبلک سروس کمیشن میں ہائر ایجوکیشن محکمے میں ہسٹری کے لیکچراروں کی اسامیوں کے انٹرویو ہے۔ بحیثیت انٹرویور میرا تقرر خفیہ رکھا گیا ہے تاکہ سفارشی فون آنے نہ شروع ہوجائیں۔ انٹرویو بھی ایک ہی دن میں ختم ہونے والا ہے۔ انٹرویو چنبر میں جانے سے قبل میرے ساتھ دیگر دو انٹرویوورس کو اپنے موبائل فون تب تک سوئچ آف رکھنے ہونگے جب تک نہ وہ انٹرویو سے فارغ ہوجائیں اور لسٹ بھی اسی وقت فائنل کرنی ہونگی۔

میرے ساتھ دیگر دو اشخاص کو بھی انٹرویو میں شامل رہنا ہے ان میں ایک پبلک سروس کمیشن کے چیرمین اور دوسرے کمشن کے ایک سینئر ممبر ہیں ایکسپارٹ بس میں ہی ہوں اسلئے متعلقہ سبجکٹ پر مجھے ہی سوال کرنے ہونگے وہ دونوں جرنل نالج پر سوال پوچھ سکتے ہیں۔

سننے میں آیا ہے کہ تیس کے قریب امیدواروں کی لسٹ فائنل کی گئی ہے اور منتخب امیدوار سخت مقابلے کے بعد ہی یہاں تک پہنچے ہیں اور کافی ذہین ہیں۔ ان میں بھی صرف بارہ کا ہی قابلیت اور میرٹ پر انتخاب ہونا ہے کیونکہ کل بارہ ہی پوسٹ ہیں جن میں بھی چار پوسٹ رزیرو کیٹگریز کے امیدواروں کے لئے مختص ہیں۔

گو کہ میرے لئے یہ کوئی نیا تجربہ نہیں ہے لیکن پھر بھی بہت محتاط رہنا پڑتا ہے کیونکہ اکثر طالب علم بڑے ذہین وفتین ہوتے ہیں سنا ہے کہ کچھ اسٹوڈنٹ غیر ملکی علمی اداروں سے بھی فارغ التحصیل ہیں اور پھر آجکل انٹرنٹ کا زمانہ بھی ہے کہ ہر سبجکٹ کے متعلق مکمل جانکاری گھر میں ہی دستیاب رہتی ہے وہ بھی بالکل آسانی کے ساتھ۔

انٹرویو میں ایک دن رہ گیا تھا اسلئے میں نے مناسب سمجھا کہ میں بھی اس سہولت کا فائدہ اٹھاؤں اور اپنی انفارمیشن ذرا اپ ڈیٹ کرلوں۔

موضوع Freedom Struggle ہے۔اتوار کی صبح ناشتہ کرنے کے بعد، اپنے ریڈنگ روم میں اطمنان کے ساتھ داخل ہو گیا حسب معمول اپنا لیپ ٹاپ آن کرلیا میل چیک کرنے کے بعد اس موضوع پر سرچ شروع کر دی۔

دنیا بھر کا اس موضوع سے رلیٹڈ مواد آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا اور کتابوں کے اوراق یکے بعد دیگرے کھلنے لگے۔جن کا تعلق مختلف ممالک کی جنگ آزادی سے تھا۔دیکھتے ہی دیکھتے میری آنکھیں ۱۹۴۰ء کے برطانوی جاسوس رچرڑ ایمرسن کی کتاب پر مرکوز ہو گئیں بنیادی طور پر یہ ایک کتاب نہیں بلکہ ایک ذاتی ڈائری ہے جسے اس وقت کے برطانوی جاسوسی محکمہ کے ایک انتہائی قابل اور پڑھے لکھے آفیسر رچرڑ ایمرسن روز بڑی باقاعدگی کے ساتھ لکھا کرتے تھے جو اس وقت ہندوستان میں محکمہ سراغرسانی میں تعینات تھے اور برطانیہ کے بڑے بڑے فوج، پولیس، سراغرساں، عدلیہ اور دیگر حکومتی اداروں کے ساتھ مل کر اس وقت ہندوستان میں چلنے والی تحریک آزادی کو دبانے کے سلسلے میں مامور تھے اور اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔

اس کتاب یا ڈائری میں ہندوستان کی Freedom Struggle کے بارے میں وہ وہ حیرت انگیز اور نا قابلِ یقیں انکشافات کئے گئے ہیں جن کا اس موضوع پر آج تک لکھی جانے والی کتابوں میں کہیں پر کوئی سرسری تذکرہ تک نہیں ہے۔خود میں نے بھی ہسٹری کے ایک طالب علمی کے زمانے سے لیکر آج تک ان کو کہیں نہیں پڑھا یا سنا ہے۔

ظاہر بات ہے کہ برطانیہ کے سراغ رساں محکمے کے چیف کی ذاتی ڈائری پر رقم یہ واقعات اس کی روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے واقعات ہیں اس لئے ان کی صحت کے متعلق سوالات کھڑے نہیں کئے جاسکتے ہیں۔ان کی اس ڈائری میں فوج ، پولیس، سراغرسانی، عدلیہ اور دیگر اہم محکمہ جات کے زمہ داروں کے میٹنگوں کا احوال بھی درج ہے۔مسائل و معاملات، فیصلوں اور تجاویز وغیرہ کا بھی، جن کی مکمل جانکاری سے مجھ

جیسا ہسٹری پڑھانے والا شخص تک، بہت پریشان ہو جاتا ہے جس کے لئے لگ بھگ نصف صدی تک یہ موضوع اوڑھنا اور بچھونا رہا ہو۔

اس ڈائری کے مصنف کی پوری ڈائری ہی انکشافات سے بھری پڑی ہے میں بطورِ خاص اس ایک واقعے کا ذکر کرنا یہاں ضروری سمجھتا ہوں، لکھتے ہیں۔

"۔۔۔۔۔۔۔۔۔ جب ملک میں ہر جگہ ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک نے زور پکڑنا شروع کر دیا۔ گولیاں، گرفتاریاں، ماردھاڑ، اقتصادی بدحالی، ظلم و جبر، باہمی رسہ کشی کو ہوا دینا اور مختلف فرقوں کو ایک دوسرے سے لڑوانے اور جھگڑوانے، فرقہ وارانہ فسادات بپا کروانے، لیڈروں اور عام لوگوں کو پیسے اور منصب کا لالچ دینے اور اس طرح کے دیگر حربے مکمل طور پر ناکام ہو گئے تو سب زمہ داروں نے ایک خاص میٹنگ میں ہاتھ کھڑے کر کے، اپنی نظریں میری طرف کر لیں اور سراغرسانی محکمے کے چیف مسٹر رچرڑ ایمرسن کو عاجزی اور انکساری کے ساتھ کچھ کرنے کی گذارش کی۔ تا کہ برطانیہ سرکار کا اقتدارِ اعلیٰ قائم رہ سکے۔

مسٹر رچرڑ ایمرسن اس سے قبل اپنی اس ڈائری پر ایک مختصر نوٹ کے زریعے سے وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس کے ماتحت اس سے قبل اندھیرا ہوتے ہی ڈراونی اور ہیبت ناک صورتیں بنا کر گاؤں اور شہروں کی مختلف آبادیوں میں جا کر اور رات کی تاریکی میں ٹین کی چھتوں پر سنگباری کر کے لوگوں کو کافی ڈرا چکے تھے تا کہ ان کی توجہ کسی اور جانب مبذول کی جا سکے لیکن ان حربوں کا بھی کوئی خاطر خواہ نتیجہ بر آمد نہ ہو سکا یہ سب آپریشن کیچ اینڈ کل اور آپریشن آل آوٹ جیسے انتہائی سنگین اور سخت اقدامات کے علاوہ تھے۔

رچرڈ ایمرسن لکھتے ہیں کہ جب سب آفسروں نے ہاتھ کھڑے کر کے بال اب میرے گول میں پھینک دی اور سب لوگ میری طرف بڑی امید کے ساتھ دیکھنے

لگے ۔تو میں نے بھی انہیں تسلی دیتے ہوئے فراخدلی سے کہا کہ آپ سب لوگ یہ معاملہ میرے اوپر چھوڑ دیجئے ،میرے ذہن میں ایک پلان ہے۔

میرے اس جواب سے میٹنگ میں موجود سب زمہ دار آفسروں کے مرجھائے ہوئے چہرے کھل اٹھے اور ان کے چہروں پر بشاشت سی دوبارہ لوٹ کر آ گئی اور میٹنگ برخواست کی گئی۔

رچرڑ ایمرسن لکھتے ہیں کہ اس میٹنگ کے تیسرے دن، شہروں اور گاؤں سے عورتوں کی چوٹیاں کاٹ دینے کی خبروں نے ایک کہرام سا بپا کر دیا اور سب لوگ عورتوں کی چوٹیاں کاٹنے کو غیرت کا معاملہ سمجھکر اپنے لیڈروں کے ساتھ سڑکوں پر آ گئے اور ہر طرف ایک نئی ہی ہاہا کار مچ گئی ۔سیاسی لیڈروں کی تقریر بازی شروع ہوگئی سڑکوں اور چوراہوں پر جلسے جلوس ہونے لگے اور اخبارات میں مذمتی بیانات شائع ہونے لگے۔

سرکاری مشینری متحرک ہوگئی پولیس اور سراغرساں ایجنسیوں کی یقین دہانیاں اخبارات کی زینت بننے لگیں کہ وہ ملزموں کو بہت جلد کیفر کردار تک پہنچائیں گیں سرکاری کمیٹیاں تشکیل دی گئیں انتظامیہ کو خصوصی ہدایات دئے گئے اور کئی بے گناہوں کو مارا پیٹا گیا اور بھی بہت کچھ کیا گیا لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ ندارد اور اس طرح کی مسلسل وارداتوں کے باوجود بھی کوئی Culprit ہاتھ نہیں لگ گیا اور نہ کوئی قصوروار ہی سامنے آ گیا۔

اس ڈائری کا آخری ورق ۳۰/ اکتوبر ۱۹۴۲ء کا لکھا ہوا ہے

انٹرنیٹ پر برطانیہ کے بدنامِ زمانہ جاسوسی محکمے کے چیف کی ذاتی ڈائری کے اوراق کو لاتعداد لوگوں نے پڑھا ہے ان میں سے لاتعداد لوگوں نے ،طرح طرح کے منفرد و مخصوص ،مخالف و متضاد، اچھے اور برے تاثرات بھی رقم یا ریکارڈ کروائے ہیں میں صرف دو لوگوں کے تاثرات کی بات کروں گا ان میں سے ایک برطانوی اور دوسرا

ہندوستانی شہری ہے۔

برطانوی شہری نے اپنے تاثرات کچھ اس طرح درج کروائے ہیں۔

"۔۔۔۔۔اس جانباز میں واقعی ملک وقوم کے لئے کچھ کرنے کا جذبہ تھا اور پھر اس قوم پرست مردِ مجاہد کا انتقال ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۲ء کو اچانک Cardic Arrest سے ہوگیا۔ خدا اسے کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ حکومت برطانیہ نے رچرڈ ایمرسن کو اسی سال اپنے سب سے بڑے فوجی اعزاز سے بھی نوازا۔

(رابرٹ بارکلے)

ہندوستانی شہری نتھو رام نے اپنے تاثرات یوں درج کروائے تھے۔

"۔۔۔۔۔۔۔اور پھر اس کے باوجود بھی ۱۹۴۷ء میں برطانوی سامراج سے ہندوستان آزاد ہوگیا اور غلامی ومحکومی، جبر واستبداد کا سورج ہمیشہ کے لئے ڈوب گیا اور آزادی کی صبح طلوع ہوگئی۔۔۔۔۔!"

مجھے لگا کہ کمپیوٹر کے اسکرین پر نیچے کرسر جیسے کچھ زیادہ ہی بیقرار ہوکر، تڑپ تڑپ کر، میرے تاثرات جاننے کے لئے مچل مچل کر تمتما رہا ہے۔

میں بھی جیسے بے بس سا ہوگیا، میری شہادت کی انگلی جیسے ہی تاثرات رقم کرنے کے لئے اوپر اٹھی پھر جیسے خود بخود معلق سی ہوکر رہ گئی، بہت کوشش کرنے کے بعد، جب میرے دل ودماغ نے اسے تاثرات رقم کرنے کے لئے آمادہ کردیا تو لیپ ٹاپ کے اسکرین پر ایک کیپشن فوراً نمودار ہوگیا۔

Sorry ونڈو تعمیل کرنے سے قاصر ہے آپ کے پاس ایک ہی آپشن بچا ہے کہ آپ اپنے لیپ ٹاپ کو سوئچ آف کریں۔

Sorry ونڈو تعمیل کرنے سے قاصر ہے آپ کے پاس ایک ہی آپشن بچا ہے کہ آپ اپنے لیپ ٹاپ کو سوئچ آف کریں۔



ایک ہی کشتی میں سوار ہم دو

''رشید موبائیل فون نے ہم سے بہت کچھ چھین لیا ہے۔ہم قلمکار ہیں کمپیوٹر اور موبائیل فون نے ہم سے ہمارا قلم بھی چھین لیا ہے اور کاغذ بھی، جب ہمارے ہاتھوں سے ہمارا قلم کاغذ ہی چھین لیا گیا ہے تو ہم کیسے اور کیونکر قلمکار ٹھہرے -------؟

اب ہماری انگلیاں لکھنے کی بجائے تھر کنے لگتی ہیں اور اب یہ انگلیاں ہی سب کچھ لکھتی اور مٹاتی ہیں اور بھیجتی بھی ہیں۔ کمپیوٹر اور موبائیل نے قلم اور لکھنے کی اہمیت کے ساتھ ساتھ ڈاک اور ڈاکیہ کی اہمیت و افادیت بھی نہ صرف گھٹائی اور کم کردی ہے بلکہ اسے بہت حد تک ختم ہی کر دیا ہے۔شکر ہے پھر بھی یہ سب چیزیں ابھی تک موجود ہیں۔

میں سعودی عرب کے دھران شہر میں بیٹھا ہوا ہوں اور یہ خط تمہارے نام لکھ رہا ہوں۔ موبائیل فون پر رابطہ نہیں کر رہا ہوں بھلے ہی میری بات تم تک دس بیس دنوں میں ہی کیوں نہ پہنچ جائے؟ مجھے کوئی جلدی بھی تو نہیں ہے۔اور نہ ہی یہ معاملہ سیریس یا فوری توجہ کا حامل ہے۔مقصد صرف اپنی اندر کی بات ، اپنے دیرینہ اور

بچپن کے دوست تک پہنچانا ہے اور اس کی رائے جاننا اور مشورہ لینا ہے۔

رشید تم واقف ہی ہو، اہلیہ کے اچانک انتقال کے سانحے نے مجھے بہت نڈھال کر دیا۔ اس عمر میں شریک حیات کا بچھڑ جانا۔۔۔۔۔؟ خاص کر جب بچے بالغ ہو چکے ہوں اور ان کے گھر بسانے کی تلاش بھی شروع ہو چکی ہو۔

دانش سعودیہ میں سیٹل ہو چکا ہے اور اپنی بیگم کے ساتھ وہیں پر رہ رہا ہے اتفاقاً ارم کی شادی بھی ایک انجینئر کے ساتھ ہو گئی ہے جو سعودیہ میں ہی ملازم ہے۔ اسلئے شادی کے فوراً بعد ہی سعودیہ چلی گئی ہے۔ ہم میاں بیوی ملازمتوں سے ریٹائر ہونے کے بعد اپنے آبائی گھر پر ہی تھے کہ ایک دن زبیدہ کی طبیعت خراب ہو گئی اور اس نے ہمیشہ کے لئے ہم سے بچھڑنے کے لئے رختِ سفر باندھ لیا۔ تم جانتے ہو ابھی وہ تندرست و توانا تھی اور فعال بھی کہ ہر نزدیک و دور کے رشتہ داروں کے پاس آتی جاتی تھی۔ کسی کو یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ وہ اتنی جلدی۔۔۔۔۔۔۔۔؟

دوست احباب، رشتہ دار اور عزیز و اقارب رفتہ رفتہ اپنے اپنے گھروں کو واپس ہو لئے اور اب بیٹا بیٹی اور داماد بھی ڈیوٹی پر لوٹ گئے ہیں۔ اپنے آبائی گھر پر قفل چڑھا کر، دانش اور ارم کے زبردست اصرار پر میں بھی سعودیہ آیا ہوں اور اب مجھے یہاں آئے ہوئے کافی دن ہو گئے ہیں کہ آج بیٹھے بیٹھے تمہاری یاد آ گئی سو یہ خط تمہیں لکھنے بیٹھ گیا۔

زبیدہ نے لگ بھگ چھتیس سال میرے ساتھ گذارے شاید تمہیں یاد بھی ہو گا جب میں اسے اپنے گھر لانے کے لئے گیا تھا تو تم بھی براتیوں میں میرے ساتھ شامل تھے اور پھر یہ چھتیس سال کیسے گذر گئے پتہ ہی نہیں چلا؟ کن کن مراحل سے گذرنا پڑا، تم خوب جانتے ہو لیکن اس کا تدبر، بردباری اور ہمت و حوصلہ مجھے کبھی پست ہمت یا کمزور نہیں ہونے دیتا تھا اور میرے اندر ایک نئی طاقت و توانائی بھر دیتا تھا۔ اور

آج۔۔۔اس کے بغیر میں۔۔۔۔۔۔اپنے آپ کو۔۔۔۔۔۔۔انتہائی اکیلا اور کمزور محسوس کرر ہا ہوں۔

کیا پتہ زندگی کے کتنے دن، مہینے یا برس باقی ہیں جنہیں ذرا اطمنان کے ساتھ گذارنے کے لئے میرے پاس کئی آپشن ہیں لیکن ہر آپشن کے دو دو پہلو ہیں جیسے سکے کے دو رخ یا پھر اڈونٹیج اور ڈس اڈونٹیج۔ تم اسے میری قوت ارادی کی کمزوری بھی کہہ سکتے ہو کہ میں کوئی فیصلہ نہیں کر پار ہا ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہئے اور کون سا فیصلہ لینا چاہئے؟

کہتے ہیں کہ جب کوئی مشورہ کرنے والا دستیاب نہ ہو تو دیواروں کے ساتھ مشورہ کرنا چاہئے جس شخص کا رشید جیسا دوست موجود ہو اس کے لئے پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ہے اسی لئے خط لکھنے بیٹھ گیا ہوں کہ تم صحیح مشورہ دے سکو گے کہ مجھے اس صورت حال کے ہوتے ہوئے کیا کرنا چاہئے؟

دانش ڈاکٹر ہے اور اس کی بیوی بھی ڈاکٹر ہے اور دونوں یہیں سعودیہ میں پوسٹیڈ ہیں بہت اصرار کرر ہے ہیں کہ میں بھی ان ہی کے ہاں ان کے پاس رہوں لیکن اپنے وطن سے بہت دور میں اس اجنبی ماحول میں رہ کر کیا کروں گا؟ یہ لوگ بہت مصروف زندگی گزارتے ہیں اور پھر یہاں کا اسٹنڈ ارڈ آف لیونگ بھی بہت اونچا ہیں۔

تم میری طبیعت سے ابتدا سے ہی واقف ہو میں کسی کے اوپر بوجھ بننا نہیں چاہتا ہوں اور نہ کسی کا احسان مند ہی، خواہ وہ میرا اپنا خون ہی کیوں نہ ہو۔ یاد ہے تم مجھے اکثر طعنہ دیا کرتے تھے کہ میں تب تک اپنی پریشانیوں کو ظاہر نہیں کرتا جب تک نہ معاملہ میری پہنچ یا برداشت سے باہر ہو جائے؟

بس وہی سمجھو آج بھی کچھ ایسا ہی ہے مسئلہ یہ ہے کہ اگر میں گھر میں رہوں تو اکیلے گزر بسر کے لئے مجبور ہوں اتنا بڑا گھر کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ نہ کوئی آگے ہے اور نہ پیچھے۔ حدِ نظر تک تنہائی ہی تنہائی ہے اور پھر اٹھنا، بیٹھنا، کھانا

، پینا، چلنا پھرنا تو ہے ہی، بیماری اور بڑھاپے کے دیگر مسائل بھی ہیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں اور کونسا فیصلہ لوں؟ ان دو آپشنوں میں کونسا آپشن اڈاپٹ کرلوں اور کسے چھوڑ دوں؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا؟

زندگی بھر اپنا بوجھا اپنے کندھوں پر ڈھونے کا عادی رہا ہوں۔ تم بھی ٹوکا کرتے تھے کہ میں کس مٹی کا بنا ہوا ہوں کہ انتہائی شدید اور ناقابل برداشت حزن وغم میں بھی آہ بھرنے یا کراہنے کا عادی نہیں ہوں سب کچھ اکیلے اکیلے سہنے کا عادی ہوں۔ اپنے آبائی شہر میں اگر کوئی قریبی یا پھر دور کا ہی رشتہ دار ہوتا تو شاید ذراسی تسلی کا باعث بھی بن جاتا لیکن تم اچھی طرح سے جانتے ہو کہ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا اور پھر میرے والدین بھی کہیں سے ہجرت کر کے اس جگہ پر آباد ہو گئے تھے۔ یہ سب باتیں یہاں دھرانے کی ضرورت نہیں ہے تمہارے ساتھ بالکل بھی نہیں کہ تم میرے بچپن کے دوست ہو لیکن ایک عرصہ بعد تم سے مخاطب ہوں اسلئے تم سے بہت باتیں کرنے کو جی چاہ رہا ہے اور پھر مجھے اس بات کا ہمیشہ سے ہی اعتراف رہا ہے کہ ہر معاملے میں صحیح فیصلہ لینے کی صلاحیت میں تم مجھ سے آگے ہو کہ تم بہت سوچ سمجھکر قدم اٹھانے کی صلاحیت رکھتے ہو جلد باز نہیں ہو اور ہر معاملے کو بہت سنجیدگی کے ساتھ لینے کے عادی ہو سرسری طور پر ہر گز نہیں خواہ وہ معاملہ کوئی معمولی معاملہ ہی کیوں نہ ہو شاید اسی لئے میں اپنے مسائل اور معاملات لے کر تمہارے پاس آیا کرتا تھا بالکل ایک بھائی کی طرح ہی ورنہ تم جانتے ہی ہو میں کسی کے پاس بہت کم جاتا تھا اور وہ عادت آج بھی بدستور قائم ہے۔

تم میری پوزیشن اچھی طرح سے جان گئے ہونگے میں جیسے تیز دھار والے نوکیلے کانٹوں پر بیٹھا ہوں۔ تمہارے جواب کا بے صبری کے ساتھ انتظار رہیگا۔ امید ہے کہ تمہارا جوابی خط پا کر میں کوئی مناسب فیصلہ لے سکوں گا اور اپنی اس ذہنی کوفت سے ہمیشہ کی لئے چھٹکارا بھی پا سکوں گا۔

تمہارا اپنا بھائی

احمد علی "

لگ بھگ ایک ڈیڑھ ماہ کے بعد مجھے رشید کا خط موصول ہوا الگ الگ سے سب کی خبر اور خیریت پوچھی تھی اپنے دیرینہ تعلقات کا تذکرہ کر کے بہت سی پرانی یادوں کو تازہ کیا تھا اس دوران رشید کے ساتھ کوئی رابطہ نہ رہنے کی وجہ سے اس کی زندگی سے متعلق کئی معاملات کا پتہ ہی نہیں چل پایا تھا اس کی بیوی کا بھی انتقال ہو چکا ہے بچے [illegible] بھی ہو چکا ہے جب [illegible] اہم واقعات کا مجھے پتہ ہی نہیں [illegible]

میں نے رشید کا خط کئی بار بہت انہماک سے پڑھا اور کئی بار کیا بلکہ بار بار پڑھا کہ میں اپنے سب سے اہم سوال کا جواب [illegible] میں تلاش کر رہا تھا۔ میری حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی کہ میں نے اس خط میں [illegible] نہیں دیکھا اور نہ اشارتاً ہی اس کا کہیں پر تذکرہ ہی تھا۔

ایسا ہو ہی نہیں سکتا ہے کہ رشید نے میرا سوال دیکھا ہی نہ ہو یا اسے پڑھا ہی نہ ہو یا پھر جواب لکھتے وقت اس کے ذہن سے بالکل اتر گیا ہو اور جو مشورہ میں نے اس سے طلب کیا ہو وہ اس پر بالکل خاموش رہا ہو، ضرور کوئی بات ہے جو میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے؟

مایوسی کی حالت میں، بار بار خط کھولنے اور بند کرنے کے بعد، جب میں اسے ٹیبل پر پھینکنے ہی والا تھا تو اچانک میری نظریں ملفوف کی پشت پر ٹک گئیں حسب معمول اس پر بھیجنے والے کا مکمل ایڈریس بھی لکھا ہوا تھا۔ ایڈریس پڑھ کر مجھ پر جیسے سکتہ سا طاری ہو گیا۔ اس خط پر ہمارے شہر کے ایک معروف Old Age Home کا ایڈریس درج تھا۔